أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر

علماء حق

اور

اُن کے مجاہدانہ کارنامے

حصہ اول

یعنی

۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۹ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات ۔ اُن کے تقاضے ۔ برطانوی سامراج اور اُس کے مقابل انقلابی جماعتیں ۔ علماء ہند کی جدوجہد ۔ ریشمی رومال والی تحریک ۔ دارالعلوم دیوبند کے اغراض و مقاصد ۔ علی گڈھ یونیورسٹی اور اُس کی غرض و پالیسی ۔ انڈین نیشنل کانگریس ۔ جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کی مساعی ۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیرِ مالٹا اور اُن کے رفقاء کرام کے حالات اور دیگر سیاسی و اجتماعی مسائل کا مستند مجموعہ ۔ جو پوری تحقیق و تنقید سے مرتب کیا گیا ہے

از: مولانا سید محمد میاں صاحب

ناشر: الجمعیۃ بکڈپو ۔ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

۷۸۶

ذروۃ سنام الجہاد

جہاد حریت ۱۸۵۷ء کے بعد

علماءِ حق

(اور)

ان کے مجاہدانہ کارنامے

۱۳۶۵ھ

حصہ اوّل

مرتبہ

مولانا سید محمد میاں صاحب

ناظم جمعیۃ علماء ہند

مطبوعہ: [illegible] آرٹ پریس

فہرست مضامین "علماء حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے" حصہ اوّل

(کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی)

نذر

اُن مجاہدینِ پر خلوص و با اخلاص کے نام
جنہوں نے اسلام کو سمجھا۔ اسلامی تعلیمات کو سمجھا۔ انکے
تقاضوں کو پہچانا۔ اور ایک مذہبی فرض سمجھ کر جنگِ
آزادی میں حصہ لیا۔ اور اُن کے اِخلاص کا یہ عالم کہ آج
اُن کا نام بھی دُنیا کو معلوم نہیں

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰاھُمُ اقْتَدِہْ

اے مُرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

نیاز مند محتاج دعا
محمد میاں

باسمہٖ تعالیٰ شانہٗ

۱۸۵۷ء کے بعد

علماء حق

اور اُن کے

مجاہدانہ کارنامے

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ النبی الأمی الکریم

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء تک

(۱) ہندوستانیوں کے دلوں میں مذہب کا احترام بہت زیادہ تھا۔

(۲) مذہبیت کی بدولت ارباب مذہب اور علماء ملت کا احترام بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ سید صاحب شہیدؒ کی تحریک کے سلسلہ میں ایک ایک مجاہد عالم کے مریدوں کی تعداد اسّی اسّی ہزار تک پہنچی ہوئی تھی جو مختلف صورتوں سے اُس جہاد میں حصہ لے رہے تھے جو سید صاحبؒ نے انگریزوں یا سکھوں کے خلاف جاری کر رکھا تھا۔

اور ایک انگریز کارخانہ دار کے بموجب اس کے دیندار مسلمان ملازم

اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جزو استہانہ کیمپ (حضرت سید صاحبؒ کے مرکز جہاد) کے لئے علیحدہ کرا کر رکھتے تھے جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کے شراد کے لئے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہکر چند ماہ کی رخصت لے لیتے تھے کہ انھیں فریضہ جہاد ادا کرنے کے لئے جہاد میں شریک ہونا ہے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈاکٹر ہنٹر بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۱۵ طبع سوم)

(۳) احساس وطنیت، فرقہ وارانہ جذبات پر غالب تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں ہندو مسلمانوں نے مل کر انگریز کا مقابلہ صرف اس لئے کیا کہ بہادر شاہ کی حکومت اور اسکی شہنشاہیت کو قائم اور برقرار رکھا جائے (تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو علماء ہند کا شاندار ماضی حصہ چہارم)

(۴) باہمی رواداری نے اقوام ہند کو ایک قوم بنا رکھا تھا۔

ان چاروں نمبروں کے لئے بہت زیادہ دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں مگر ہم ان نمبروں کے تفصیلی جوابات کو علماء ہند کے شاندار ماضی کے حوالے کرتے ہیں اور یہاں مذکورہ بالا مختصر اشارات پر قناعت کرتے ہوئے صرف نمبر ۴ کے لئے نقول پیش کرتے ہیں۔

(أ) کپتان[۱] الگزنڈر ہملٹن سندھ کے ایک شہر ٹھٹھہ کے متعلق لکھتا ہے۔

---

[۱] کپتان الگزنڈر ہملٹن سترھویں صدی میں ہندوستان آیا تھا جبکہ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت شروع ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عقیدوں کے گروہوں کے درمیان اختلاف عقائد کی بنا پر کشت و خون اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ سلطنت کے حکم سے مخالف عقیدہ رکھنے والے بچوں کو زندہ جلا دینے تک کے واقعات پیش آتے رہتے تھے مگر ہندوستان کی حالت اسکے برعکس تھی۔ (حکومت خود اختیاری کی نمبر ۱۲۱۵۰)

یہاں ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طرح برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں مناتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن انکی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مُردوں کیساتھ ستی ہوں۔

آگے چل کر تحریر کرتا ہے صرف بنیوں کے ۸۵ فرقے ہیں اور گو کہ وہ ایک دوسرے کیساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ وہ گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں انکے ان کے اخلاق عموماً شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے بدتر ہو جاتے ہیں۔

شہر سورت کی نسبت لکھتا ہے اس شہر میں تقریباً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات اور طریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے کے مطابق اپنے معبود کی پرستش کرے[1]۔

مسٹر جان بینارڈ جو کبھی پنجاب ایگزیکیٹو کونسل کا سینئر ممبر رہ چکا تھا۔ لندن کے ایک جریدے موسومہ معاملاتِ خارجیہ میں رقمطراز ہے۔

---

[1] حکومت خود اختیاری ص۱۵

ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت نہ قائم ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ برطانیہ سے پہلے بھی ظالم سلاطین گذر چکے ہیں جنھوں نے کبھی غیر مسلمین پر جزیہ لگایا اور کبھی گائے ذبح کرنے پر مجنونانہ جوش میں سزائیں دیں۔ لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا اور خواہ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف پرستش رہتے تھے۔[1]

سر جان مینارڈ کے قول کی تائید میں صدہا تاریخی واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں سے ایک بطور نمونہ یہ ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی سے مرہٹوں کی لڑائی ہوئی تو مرہٹوں کا توپ خانہ[2] مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ توپ خانہ ایسی اہم چیز ہے کہ اس پر لڑائی کا تمام تر دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ آج تک[3] انگریزوں نے اپنے توپ خانے کو ہندوستانیوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی اور جب اس لڑائی میں احمد شاہ کے مقابلے میں مرہٹے ہار گئے اس وقت احمد شاہ ابدالی نے مسلمان توپچیوں کو ان کی مردانگی اور نمک حلالی پر بڑی داد دی اور ان سے خواہش کی کہ وہ احمد شاہ کی فوج میں آجائیں۔ مگر ان مسلمانوں نے جواب دیا کہ انکے آقا ہاریں یا جیتیں وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر

---

[1] ماخوذ از ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے بحوالہ حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۲ [2] مرزا توپخانہ کا نام ابراہیم خاں گردی تھا (تاریخ ہند) اور اس موقع پر یہ بھی یاد رکھیے کہ سیدؒ کے توپخانہ کا داروغہ خادم راجہ رام نام ایک راجپوت ہندو تھا جو جنگ اتمان زئی میں تمام رات تنہا سید صاحب کی طرف سے سکھوں پر گولہ باری کرتا رہا۔ ملاحظہ ہو سوانح احمدی صفحہ ۱۱۰ [3] ۱۹۳۵ء تک

دوسری جگہ نہیں جا سکتے۔ اس سلسلہ میں ملک کے اندرونی نظام کا اندازہ کرنے کے لئے گورنمنٹ کی رپورٹ پنجم ۱۸۱۲ء سے اقتباس کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس میں تحریر ہے۔

میونسپل (مقامی) گورنمنٹ کے اس سادہ نظام میں اہل ملک ایک نامعلوم زمانہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں وہ یہ فکر نہیں کرتے کہ بادشاہت ٹوٹ گئی یا منقسم ہوگئی جب تک ان کا گاؤں صحیح و سالم ہے انھیں پرواہ نہیں کہ وہ کس سلطنت میں داخل ہوگیا۔ یا کس بادشاہ کے قبضہ میں آگیا۔ اس کے اندرونی زندگی کے آئین اور دستور منقلب نہیں ہوتے۔

ہندوستانیوں کی اسی وسیع الخیالی اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردانہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ بقالان یورپ ہندوستان میں آکر اطمینان سے رہے۔ ہندوستان کی تاریخ سے واضح ہے کہ ہندوستانی کبھی قوم یا مذہب کے اختلاف کی بنا پر انگریزوں سے نہیں لڑے۔ جس طرح آسٹریلیا اور امریکہ کے اعلیٰ درجہ کے مہذب لوگ کالے لوگوں کو اپنے ملک میں آباد ہونے سے روکتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے کبھی اس طرح کسی کو نہیں روکا اور ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے امن کے ساتھ یکجا رہتے رہے[1]

سر ہنری ایلیٹ جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کو مسخ کر کے اسکو تفرقہ انگیز مذہبی افسانوں کا گندہ ٹوکرا بنا کر ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا

---

[1] حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۲ و ۵۳

اور جس کے تراجم اور اقتباسات اسکولوں میں داخل کرا کر ہندوستانیوں کی ذہنیت کو برباد کیا گیا۔ وہ دیباچہ میں لکھتا ہے۔ بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے احساسات، توقعات اور معتقدات ہیں معلوم ہوتے مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلامِ پاک کہتے ہیں اور اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔ صـ ۲۵۵ روشن مستقبل

مسلمانوں میں سیکڑوں ہندوانی رسومات اب تک جاری ہیں۔ پرانے ہندو مسلمان فقرائے سے خاص عقیدت رکھتے تھے ان کے تعویذوں کو برکت جانتے تھے اور اپنے بچوں کو اسلامی مکتبوں میں تعلیم دلاتے تھے۔ بیاہ شادی کے موقعوں پر شرکت اور لین دین کی رسومات آج تک بہت سے علاقوں میں جاری ہیں۔ گاؤں کے بچے بڑوں کو چچا تاؤ کہتے تھے خواہ ہندو ہو یا مسلمان۔ اور بڑے بوڑھے ہندو مسلمان گاؤں کے چھوٹوں کو اولاد جانتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اتفاق و اتحاد کی اصل بنیاد

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس موقع پر شاہ بابر کی ایک وصیت[1] بھی نقل کر دیں جو سلاطین مغلیہ کی حکومت کی سنگ بنیاد تھی اور ہندو مسلم تعلقات کی خوشگواری کی اساس اول

شاہ بابر نے اپنے فرزند ارجمند ہمایوں کو وصیت کی تھی۔

اے پسر سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے۔ الحمد للہ اس نے اسکی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات

---

[1] یہ وصیت ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل رام راج کالج کولہاپور کے قلمی مسودہ سے نقل کر کے اخبار خلافت بمبئی نمبر ۱۹ اگست ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

مذہبی کو لوحِ دل سے دھو ڈالو اور عدل و انصاف میں ہر مذہب و ملت کے طریق کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ نہیں کر سکتے اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطافِ شاہانہ سے مرہون ہوتی ہے جو قوم و ملت قوانین حکومت کی مطیع اور فرمانبردار رہے اسکے مندر اور مزار برباد نہ کئے جائیں۔ عدل و انصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ ظلم و ستم کی نسبت احسان و لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ و سنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائیگا جس طرح انسان کے جسم میں مل جل کر چار عناصر کام کر رہے ہیں اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور ان میں اتحاد عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے۔ سرگزشت تیمور کو جو کہ اتحاد و اتفاق کا مالک تھا ہر وقت اپنی نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم و نسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو۔

(اخبار خلافت بمبئی نمبر ۱۹ اگست ۱۹۲۶ء)

انگریزی حکومت کا نظریہ اس کے برعکس یہ تھا۔

ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات سے واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی اور ملکی نظم و نسق سے یہ اصول ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیئے کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو[1]

سر جان میلکم نے کہا تھا۔

---

[1] حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۱ ؎ ۱۲

اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں انکی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھکر ہماری قوت کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی[1]

مسز اینی بسنت لکھتی ہیں۔

کمپنی والوں کی جنگ سپاہیوں کی جنگ نہ تھی بلکہ تاجروں کی جنگ تھی۔ ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے اور رشوت و سازش نفاق اور خدعہ جو کی دورخی پالیسی پر عمل کرکے اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے لڑا کر کے اسے یہ ملک حاصل ہوا[2]

تحفظ حکومت اور شہنشاہیت کے متعلق انگریزی پالیسی

احترام[1] مذہب۔ احساس[2] وطنیت۔ احترام[3] علماء اور باہمی[4] رواداری جو ہندوستانیوں کے قدیمی امتیازات تھے مسلمان بادشاہوں کی طرح انگریزوں کے لئے بھی مضر نہ ہوتے اگر انگریزوں کا مقصد ہندوستان میں حکومت کرنے سے ہندوستان کو لوٹنا اور امراء یورپ کی جوع الارض کو سیر کرنا نہ ہوتا۔

---

[1] کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم از میجر باسو صفحہ ۱۸ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۶ طبع سوم۔
[2] روشن مستقبل صفحہ ۴۹

لیکن بقول "برک" سابق فاتحین اور انگریزوں میں ایک فرق تھا۔ اور وہ یہ کہ سابق فاتحین کی خوشحالی اور بربادی ان کے نئے وطن ہندوستان کی خوشحالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہوجاتی تھی اور ان کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ کہ اسی سرزمین میں ان کی اولاد پھلے پھولے گی۔ اسی طرح ان کے بیٹوں کو بھی اپنے اسلاف کی یادگاریں یہیں محفوظ نظر آتی تھیں۔ زمانہ سابق کے فاتحین کاشتکار اور صناع سے بھاری محصول تو لیتے تھے لیکن وہ انکی جیبوں کو جن سے دوبارہ فائدہ اٹھانا تھا از سر نو بھر بھی دیتے تھے۔ لیکن انگریزی حکومت میں یہ نظام بالکل بدل گیا۔[1]

بہر حال یہ حقیقت اب اتنی روشن ہوچکی ہے کہ اس کے متعلق دلائل پیش کرنا وجود آفتاب پر دلائل پیش کرنے کے مرادف ہے۔

مختصر یہ کہ جب انگریز کا نظریہ ابتدا ہی سے یہ تھا کہ ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ یورپ کے لئے حاصل کرے تو قدرتی طور پر ہندوستان کا مفاد اس کے مفاد کے مخالف تھا۔

اس کا فائدہ صرف اسی صورت میں تھا کہ ہندوستان بے کس اور بے حس مزدور کی حیثیت سے روپیہ کماتا رہے اور یورپ کے حوالہ کرتا رہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے لامحالہ انگریز کو صرف وہی صورتیں سوچنی اور عمل میں لانی تھیں جن سے

(ا) احساس وطنیت ختم ہو۔

(ب) جن با حمیت حریت پسند جماعتوں یا افراد کا عام ہندوستانیوں پر اقتدار ہے اس کو اٹھایا جائے۔

---

[1] روشن مستقبل صفحہ ۵۶ ۱۲

(ج) جبکہ مذہبی جماعتوں کا عوام پر اقتدار تھا تو ضروری ہوا کہ یا تو عوام کو اپنا ہم مذہب کیا جائے ورنہ کم از کم ان کو اپنے مذہب سے متنفر کر دیا جائے۔

(د) ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کیے جائیں جن کی بناپر وہ بھوکے اور قلاش ہو کر بھی انگریز کے وفادار رہیں۔

(ک) ہندوستانیوں کو ایک دوسرے سے اتنا خائف کر دیا جائے کہ وہ انگریز کے وجود ہی کو اپنی سلامتی تصور کریں۔

آؤ ۔۔۔ ان سیاہ فام ہندوستانیوں کی تعلیم کو ختم کر دو۔ ان کے فکر و تدبیر کے سرچشموں کو خشک کر دو ۔۔۔ تاکہ یہ بہتر مزدور ثابت ہوں اور ابدالآباد کے لیے انکی قسمت پر غلامی کی مہر لگ جائے ۔۔۔ یہ تھا پہلا نظریہ خود غرض، کمینہ طبیعت گورے ساہوکاروں کا۔ جو تجارت کے ساتھ قزاقی بھی کر رہے تھے۔

لیکن کیا یہ جاہل انگریز کے وفادار ہوں گے؟ اور کیا ان کے دلوں سے اپنے مذہب اور مذہبی پیشواؤں کا اقتدار بھی اُٹھ جائے گا ۔۔۔ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ان کو کرسچن بنالیا جائے ۔۔۔ یہ تھا دوسرا نظریہ۔ ان ملت فروش سیاسی ڈاکوؤں کا جنہوں نے مذہب کو سیاست کا آلہ کار بنایا اور اس کی تعلیم دی۔

مگر کیا انگریزی حکومت کی مشنری کو کچھ تعلیم یافتہ غلاموں کی ضرورت نہ ہوگی؟ اور کیا دفتروں کے کلرک بھی لندن سے ہی بلائے جائیں گے؟ یہ تیسرا سوال تھا جس کے حل کے لئے برطانوی ڈپلومیسی کے ماہرین نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور ایسے طرز تعلیم پر غور ہونے لگا جو ان کی اغراض اور ان کے

منشار کے مطابق ہندوستانی نوجوانوں کے دماغ کی تخلیق کرے۔

یہ ہے مختصر ایجنڈا ان غور طلب مسائل کا جن کے حل کے لیے ہندوستانی مفادات کے غاصب برطانوی سامراج کے کٹر وفاداروں کے دماغ عرصہ تک الجھے رہے۔ اس ایجنڈے کے بپیش نظر ہماری آئندہ بحث کے موضوع یہ تین امر قرار پاتے ہیں۔

(۱) ہندوستانیوں کو جاہل بنانا (۲) عیسائی بنانا (۳) لامذہب بنانا۔

تعلیم کے متعلق انگریزی پالیسی

ہندوستانیوں کو خواندہ سے ناخواندہ بنایا جائے

اس موضوع کے متعلق انگریزوں کی جدوجہد کے بیان سے پیشتر ضروری ہے کہ ہندوستان کی تعلیمی حالت پر ایک نظر ڈالی جائے۔

انگریزی عملداری سے پیشتر ہندوستانیوں کی تعلیمی حالت

لڈلو نے تاریخ برطانوی ہند میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کے ہر موضع میں جو قدیم حالت پر قائم رہے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ حساب میں ان کو خاص مہارت ہوتی ہے مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گاؤں کا اسکول غائب ہوگیا ہے[1]

اسی طرح انڈین ریفارم سوسائٹی نے جو ۱۸۵۳ء سے انگلستان میں قائم تھی اپنے ایک رسالہ میں لکھا تھا۔ ہندوؤں کے زمانہ میں ہر موضع میں ایک

---

[1] تاریخ باسو جلد پنجم صفحہ ۱۹۸ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۲۵ و تعلیمی ہند صفحہ ۱۔

مدرسہ ہوتا تھا ہم نے چونکہ دیہاتی کمیٹیوں یا میونسپلٹیوں کو توڑ دیا تو اس سے اسکے باشندے مدارس سے بھی محروم ہو گئے اور ہم نے انکی جگہ کوئی چیز قائم نہیں کی لیے

سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے ؎

"پروفیسر ماکس میلر" کے حوالہ سے مسٹر کیر ہارڈی نے لکھا ہے -

انگریزی عملداری سے قبل (بعہد عالمگیر رح) بنگال میں اسی ہزار (۸۰۰۰۰) دیسی مدرسے تھے - اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا؎

کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے -

"شہر ٹھٹھہ" (سندھ) میں چار سو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے - ؎

سر ولیم ہنٹر نے لکھا تھا -

قبل اس کے کہ ملک ہمارے ہاتھوں میں آئے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہن اور فراست کے اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے - ان کا نظام تعلیم اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا - مسلمانوں کا نظام تعلیم ہندوستان کے تمام دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا (مسلمانوں کے افلاس کا علاج منجانب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۶ء)

لے روشن مستقبل ص ۱۲۵ ؎ تاریخ مقریزی بحوالہ تعلیمی ہند ص ۳ ؎ اس تخمین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بنگال کی کل آبادی کم و بیش تین کروڑ بیس لاکھ تھی مگر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ بعہد عالمگیر رح میں بہار اور اڑیسہ کے بہت سے اضلاع بنگال میں شامل تھے "۔

؎ روشن مستقبل ص ۱۲۵ ؎ تعلیمی ہند ص ۳

اس سلسلہ میں "سر تھامس رو" کا بیان زیادہ واضح ہے۔ آپ نے برطانوی قبضہ سے پیشتر ہندوستان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے

ہندوستانیوں کا طریقہ کاشت کاری بے مثل۔ صنعت و دستکاری کے معاملہ میں ان کی استعداد اعلیٰ۔ ہر قریہ میں ایسے مدارس جن میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہو۔ ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد۔ اسکی عزت وعصمت وعفت کا پورا پورا لحاظ، یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستانیوں کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کیجائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ [1]

اس موقع پر یہ بھی خیال رکھنا مناسب ہے کہ کمپنی کی ان تمام مخالفانہ اور جابرانہ کارروائیوں کے باوجود جن کا کچھ تذکرہ آگے آتا ہے ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی تعلیمی اور ذہنی حالت جو کچھ باقی رہ گئی تھی اس کا اندازہ بنگال سول سروس کے ایک افسر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے۔

عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں، اور نسبتاً ہندو ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں، علاوہ

---

[1] تعلیمی ہند ص ۲

اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت بہت زیادہ ہوتی ہے [1]
پنجاب کے سررشتہ تعلیم کی رپورٹ سب سے اول ۵۶-۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی تھی
اس وقت مسٹر آرنلڈ سررشتہ تعلیم کے افسر اعلیٰ تھے انہوں نے مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا۔
بحیثیت معلمی کے میدان مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلمانوں کے
اسکولوں میں فارسی پڑھنے کے لئے بے شمار ہندو لڑکے ان پر اعتماد
کرکے پڑھنے آتے ہیں۔
اس کے بعد ۶۱-۱۸۶۰ء کی رپورٹ میں کپتان فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم لکھتا ہے۔
مسلمان اساتذہ کی بیشی جو ان درسگاہوں میں ٹریننگ حاصل کررہے
ہیں بالکل عیاں ہے ۴۴۳ مسلمان استاذ اور ۱۱۱ ہندو اور ۲۶ دوسری
ذاتوں کے ہیں [2]
(ب) اقتباسات بالا سے عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی
حالت کا کسی قدر اندازہ ہوگیا۔ لیکن جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء یعنی جہاد حریت ۱۸۵۷ء
سے ایک صدی بیشتر سے ہندوستان کی حکومت اسی کمپنی کے قبضہ میں آنی
شروع ہوگئی جو تجارت کرنے اور روپیہ بٹورنے کے لئے ہندوستان آئی تھی۔
کمپنی کے مالک بقول جسٹس سید محمود صاحب صرف یہ چاہتے تھے کہ تجارت
اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں اس
لئے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اپنا کام نہ سمجھتے تھے [3]

---

[1] روشن مستقبل صفحہ ۱۵۰، ۱۲ [2] روشن مستقبل صفحہ ۱۶۰/۱۶۱، ۱۲ [3] تاریخ تعلیم صفحہ ۲ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۲۵، ۱۲

تجارتی لوٹ مار صنعت کی بربادی، کاشتکاروں اور زمینداروں کی تباہی کے ساتھ اس کمینہ اور خود غرض حکومت (جو ایک ہی وقت میں سوداگر بھی تھی اور حاکم بھی) کی خود غرضی اور تعلیم سے قطعاً بے نیازی کا اثر یہ پڑا کہ جیسے جیسے کمپنی کی حکومت بڑھتی رہی علم و فضل کے بجائے جہالت پھیلتی رہی۔

چنانچہ ۱۸۲۳ء میں آنریبل۔ ایم۔ انفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس یہ ہے۔

انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مٹا دیئے بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گُم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس الزام کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ [۱]

(۲) عیسائی بنانے کی کوشش

وہی آنریبل مسٹر انفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن اپنی اسی یادداشت میں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس الزام کے رفع کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

میں علانیہ نہیں تو در پردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے۔ تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی

---

[۱] روشن مستقبل صفحہ ۱۳۳ - ۱۲

شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔
اگر تعلیم سے ان کی رائیوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے
مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایمان دار اور محنتی رعایا
تو ضرور بن جائیں گے ۔[1]

اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے قابل اعتراض طریقوں سے اسکولوں
میں مذہب عیسوی کی تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں چارلس
گرانٹ نے اپنی کتاب میں جو اشاعت تعلیم کے بارے میں لکھی تھی صاف تحریر کیا ہے کہ

اس میں کلام نہیں کہ سب سے اہم تعلیم جو ہندو ہماری زبان میں پا سکتے تھے
وہ ہمارے مذہب کی تعلیم تھی جو متعدد رسالہ جات میں آسان الفاظ
میں درج ہے اور جو مکمل طریقہ سے انجیل مقدس میں موجود ہے۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت حد درجہ خراب ہے اور اس لئے ان کی
سوسائٹی نہایت ذلیل ہے۔ ان خرابیوں کی اصلاح قانون کے نفاذ
سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ قوانین کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں در اصل
تمام خرابیوں کی جڑ اُن کے مذہبی مراسم ہیں۔ جن کی روح اُن کے قوانین
میں موجود ہے۔ اور اُن کے جھوٹے ناپاک اور قابل مضحکہ مذہبی اصولوں
میں مضمر ہے۔

ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہنچائی

---

[1] تاریخ تعلیم ص۱۴۹ بحوالہ روشن مستقبل ص۹۵ ۱۲

جائے جو تاریکی میں ہیں۔ بالخصوص ہمارے ربانی مذہب کے خالص اور پاک اصول انھیں بتائے جائیں۔

اس بارہ میں ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ جس سچے مذہب سے ہم مستفیض ہوتے ہیں اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچائیں (تاریخ التعلیم مصنفہ جسٹس سید محمود صفحہ ۱۳۔

مندرجہ بالا اصول کو پیش نظر رکھ کر حکومت کی طرف سے انگریزی تعلیم کیلئے عیسائی مبلغین کی مالی اور مادی امداد کی گئی۔ صوبہ بنگال میں ۱۸۵۱ء میں پادریوں کا اضافہ اس غرض سے کیا گیا کہ وہ پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم دیں۔

اسی طرح مدارس میں کورٹ آف ڈائرکٹران نے "مسٹر سیوارٹز" مشنری کو اسکولوں کی امداد کے لیے مستقل سالانہ امداد دی اور اسی قسم کے اور اسکولوں کی امداد کی منظوری دی لہ

بہرحال یہ ابتدائی رجحانات اور خیالات تھے۔ اس کے بعد اگرچہ ظاہری طور پر حکومت کی جانب سے بھی کوشش ہوتی رہی کہ سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہ دی جائے۔ مگر واقعات کا اگر علم حاصل کرنا ہو تو سرسید مرحوم کی تصنیف "اسباب بغاوت ہند" کا مطالعہ کیا جائے جس کے برخلاف انگریزوں کی جانب سے آج تک کوئی تردید نہیں کی گئی۔ سرسید کے مضمون کا اقتباس ہم پہلے درج کرآئے ہیں۔ اس بحث کی مناسبت ہمیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس مضمون کے اعادہ پر مجبور کر رہی ہے۔

لہ حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۵

سرسید تحریر کرتے ہیں۔
سب کو یقین تھا کہ گورنمنٹ علانیہ مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی
البتہ خفیہ تدبیریں کرکے جس طرح عربی اور سنسکرت کو فنا کر دیا اسی طرح ملک
کو مفلس اور جاہل بنا کر اور اپنے مذہب کی کتابیں اور وعظ و تبلیغ کو پھیلا کر نوکری
کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کرے گی۔
۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ شمالی، مغربی
اضلاع میں گورنمنٹ کے طرز عمل کے لئے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو
اس طرح مفلس و محتاج کرکے اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔ جیسے جیسے گورنمنٹ
کی فتوحات زیادہ ہوتی تھیں۔ ہندوستانیوں کو رنج ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کو یقین
تھا کہ جب کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلہ اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا۔ ہمارے
مذہب اور رسم و رواج میں کھلے بندوں مداخلت کرے گی۔ سب جانتے تھے
کہ گورنمنٹ نے پادریوں کو مقرر کیا۔ ان کو تنخواہ دیجاتی ہے۔ دیگر اخراجات اور
تقسیم کتب کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیجاتی ہیں۔ اور ہر طرح ان کے مددگار
اور معاون ہیں۔ حکام شہر اور افسران فوج ماتحتوں سے مذہبی گفتگو کرتے تھے
اپنی کوٹھیوں پر بلا کر پادریوں کا وعظ سنواتے تھے۔
غرضکہ اس بات نے یہاں تک ترقی پکڑی تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا
کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا اور ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا
تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب مفت تقسیم کی جاتی تھیں جن
میں دوسرے مذہب کے بزرگوں پر اعتراضات اور رکیک حملے ہوتے تھے ہندوستان

میں وعظ اور کتھا کا یہ دستور ہے کہ اپنے اپنے معبد اور مکان پر بیٹھکر یہ کہتے ہیں جسکا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سُنے۔ پادری صاحبان کا طریقہ اس کے برخلاف تھا وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے۔ اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے کچھ نہ کہتا اور بسا اوقات چپراسیوں کو اپنے ہمراہ لیجاتے۔ مشنری اسکول بہت قائم کیئے ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ بڑے بڑے حکام ان اسکولوں میں جاتے اور دوسروں کو ان میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا۔ مذہبی سوالات کے جوابات اگر عیسائی مذہب کے مطابق دیئے جاتے تو ان نو عمر بچوں کو انعامات ملتے۔ لوگ مجبوراً اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل کراتے کیونکہ ان کی حد سے زیادہ مفلسی اور محتاجی نے اولاد کی تعلیم کے لیئے ان اسکولوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ تعلیم نہ رکھا تھا جس کے بعد وہ بسر اوقات کی شکل نکال سکے۔

دیہاتی مکاتب نے یہ یقین اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا تھا کہ ان کا مقصد صرف عیسائی بنانا ہے انسپکٹر اور ڈپٹی انسپکٹروں کو کالا پادری کہتے تھے۔ یہ لوگ افسران بالا کو خوش کرنے کے لیئے زبردستی بچوں کو ان مکاتب میں داخل کراتے درانحالیکہ بچوں کے ماں باپ کو یہ یقین ہوتا تھا کہ یہ سب عیسائی بنانے کا جال ہے۔

انھیں کالے پادریوں کے سرٹیفکٹ پر ملازمت مل سکتی تھی۔

اسی طرح لڑکیوں کے اسکول بھی قائم کیئے گئے جن کے ناگوار طرز نے یقین دلا دیا کہ عورتوں کو بد چلن اور بے پردہ کرنے کے لیئے یہ طریقہ نکالا گیا ہے۔

جیل خانوں میں ایک شخص کا پکایا ہوا کھانا کھانے کا قانون بنایا گیا۔

۱۸۵۷ء میں پادری "اینڈ منڈ" نے دار العمارت کلکتہ سے عموماً لوگوں کے پاس اور خصوصاً سرکاری ملازمین کے پاس خطوط بھیجے جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی۔ اس لئے آپ کو بھی صرف ایک مذہب عیسائی میں داخل ہونا چاہیئے۔

ان خطوط کے آنے سے سب پر دہشت طاری ہو گئی۔ خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس چیز کے منتظر تھے آخر وہ آ ہی گئی۔ اب سارے سرکاری ملازموں کو عیسائی بننا پڑے گا۔ سرکاری ملازم اُن کو شرم کی وجہ سے چھپاتے پھرتے تھے۔ کیونکہ ان کے دوست انکو طعن دیتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ سرکاری ملازموں کو ایک دن کرسٹان بننا پڑے گا وغیرہ وغیرہ

(ملاحظہ ہو صہ۱۶ تا صہ۲۳ و صہ۵۶، ۵۷ اسباب بغاوت ہند)

اس قسم کے جذبات کا سلسلہ جو ہندوستان کے ملازم انگریزوں اور عیسائیوں سے لیکر پارلیمنٹ تک قائم تھا اس کا اندازہ مسٹر منگلس ممبر پارلیمنٹ کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں پارلیمنٹ کے دار العوام میں کی تھی اور جس نے آتش جہاد کے مشتعل کرنے میں خاص اثر کیا۔ مسٹر مینگلس نے کہا۔

خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگین ہے۔ تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندستان کو عیسائی بنانے کی عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے

اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیئے (حکومت خود اختیاری)

ردِ عیسائیت کے متعلق علماءِ ملت کی خدمات

ردِّ عیسائیت بظاہر ایک واعظانہ اور مناظرانہ چیز ہے جس کو سیاست سے بہ ظاہر کوئی تعلق نہیں۔

لیکن غور کرو جب حکومت عیسائی گر ہو جس کا نقطہ نظر ہی یہ ہو کہ سارا ہندوستان عیسائی مذہب اختیار کرلے اور اس کی تمنا دلوں کے پردوں سے نکل کر زبانوں تک آرہی ہو اور بے آئین اور جابر حکومت کا فولادی پنجہ اس کی امداد کر رہا ہو تو یہی تبلیغی اور خالص مذہبی خدمت کس قدر سیاسی اور کتنی زیادہ سخت اور صبر آزما بن جاتی ہے ....

بلا شبہ ردِ عیسائیت کے سلسلہ میں ہر ایک مناظرہ، ہر ایک تبلیغ، ہر ایک تصنیف اغراض حکومت سے سراسر بغاوت تھی۔ انتہا یہ کہ ۵۷ء کے بعد بھی علماء کرام کی ایک جماعت کو اس پر عبور دریائے شور کر دیا گیا کہ وہ انگریزوں کو نصاریٰ اور نصرانی کہتے تھے اس وقت اس گمراہ کن تحریک کے مقابلہ پر کون سینہ سپر ہوا۔ کس نے ہتھیلی پر سر رکھ کر عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔ کس نے پادریوں کا تعاقب کیا۔ مناظروں سے ان کو لاجواب کیا۔ ان کی تردید میں کتابیں لکھیں۔

یہی علماء ملت تھے جن کو انگریز اور انگریزی ایجنٹوں نے گالیاں سنائیں اور سناتے رہے۔ جنکو تنگ نظر۔ جاہل۔ مذہبی۔ مجنون اور پاگل کہا گیا۔ اور بدنام کیا گیا۔ کس قدر ستم ہے کہ وہ دجال پادری جو لوٹ کے روپیوں سے لاکھوں روپیہ

سالانہ کی تنخواہ پاکر ہندوستانیوں کی دین اور دنیا خراب کریں۔ نہ صرف اُن کی گردنوں کو بلکہ ان کے دلوں کو گورنمنٹ برطانیہ کی چوکھٹ پر جھکائیں۔ اور ظاہر اور باطن۔ عمل اور عقیدہ ہر ایک لحاظ سے ابد الآباد کے لیئے ان کو غلام بنا دیں۔ وہ تو مقدس خادمانِ خلق۔ پاکباز مجاہد اور وہ علماء جو ان کے دام فریب میں آنے سے انکار کر دیں اور اپنے بھائیوں کو ان کے مکر سے آگاہ کر دیں۔ وہ مجنوں پاگل۔ تنگ نظر۔ جاہل۔

"بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"

اس سے بڑھ کر ستم اور ظلم ہے ان خود غرض ہندوستانیوں کا جو آج تک علماء کو مطعون کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی سے روک کر سیاست میں ہندوؤں سے پیچھے کر دیا۔

بلاشبہ علماءِ امت نے انگریزی اسکولوں سے بائیکاٹ کا حکم دیا اور نہایت دلیری، خودداری اور پامردی سے انگریز کی منحوس اغراض کو فیل کیا لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کیا آج اعتراض کرنے والے اصحاب کسی مسلمان گھرانے کے فرزند ہو سکتے تھے۔

مس میو کا ارشاد ہے۔

عیسائی مبلغوں کے طرزِ عمل سے مسلمان انگریزی تعلیم کو مذہب عیسوی کی تعلیم کے مرادف سمجھتے تھے اور بمقابلہ ہندوؤں کے وہ اپنے بچوں کو پادریوں کے زیر اثر رکھنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے غرور اور ان کی مذہبی خودداری کو اس سے اشتعال ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اس تحریک سے علیحدہ رہے۔

(مادر ہند صفحہ ۲۸۹ بحوالہ حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۶)

کیا اس سے زیادہ کوئی ظلم ہو سکتا ہے کہ اس سوجبسی تعصب تو اس بائیکاٹ کو خودداری اور قومی غرور سے تعبیر کرے۔ اور ہمارے خود رولیڈر اس کو غداری اور علماء کی کوتاہ اندیشی قرار دیں۔ افسوس!

چشم خونیں کہ برکند باد   عیب نمائند ہنرش در نظر

مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی دور میں وہ مسلمان جن کے عزم تعلیم۔ صلاحیت۔ ذہنی استعداد اور نظم وتنظیم کے سامنے ہندو طفل مکتب تھا۔ وہ خود ہندوؤں کے سامنے طفل مکتب بن گئے۔ مگر اس کا اصلی سبب بقول سید طفیل احمد صاحب علیگ (مصنف حکومت خود اختیاری) یہ ہے۔

انگریزوں کی ابتدائی عملداری میں سرکاری دفاتر فارسی زبان میں تھے اور معلوم ہوا کہ شاہ عالم ثانی سے اور انگریزوں سے ۱۸۰۶ء میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں قرار پایا تھا کہ دفاتر کی زبان فارسی رہے گی۔

لیکن خاص اسی زمانہ میں دوسری اسکیم بھی زیر عمل تھی جس پر تقریباً بیس سال پیشتر سے بحث ہو رہی تھی۔

چنانچہ "مسٹر چارلس گرانٹ" ڈائرکٹر کمپنی نے ۱۷۹۳ء سے اجراء تعلیم کی تائید میں ایک رسالہ لکھنا شروع کیا ۱۷۹۸ء میں جا کر ختم ہوا جس کے حسب ذیل اقتباسات[1] حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں

---

[1] اسی مضمون کا ایک فقرہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوؤں کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ۲، ص ۱۳ روشن مستقبل

(۱) یہ بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اُس کے ذریعہ سے ہمارے فنون فلسفہ اور مذہب کی تعلیم دے یہ تعلیم خاموشی کے ساتھ تمام غلط باتوں کی بیخ کنی کر دے گی۔

(۲) مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوں گی۔

(۳) ہندو اس قدر کمزور دل ہیں کہ ان میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہونے کی ہرگز امید نہیں۔

(۴) جس طرح مسلمانوں نے دفتری زبان فارسی رکھی تھی اسی طرح انگریزی جاری کرنے سے عدالتوں اور دفاتر کے کام میں آسانی ہوگی اور ہندو اُسے خوشی سے حاصل کرینگے[۱] کیونکہ اُس سے انکی وقعت اور اہمیت بڑھے گی۔

سر ولیم ہنٹر کا بیان ہے۔

اپنی عملداری کے اول بچھتر سال میں یعنی ۱۸۳۲ء تک ہم نے اپنے انتظامی عہدہ دار تیار کرنے کے لئے مسلمانوں کے اسی سابق نظام تعلیم کو جاری رکھا۔ اس دوران میں ہم نے اپنا سررشتہ تعلیم قائم کر دیا تھا۔ اور جوں ہی اس سے ایک نسل تیار ہوگئی ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اٹھا کر پھینکدیا۔ جس سے مسلمان نوجوانوں کی ملازمت کے عام راستے بند ہو گئے۔[۲]

پھر اس نسل کو تیار کرنے کے لئے ہندوؤں سے کام لیا گیا۔ حتیٰ کہ بقول "سر ولیم ہنٹر"

---

[۱] روشن مستقبل صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱ [۲] مسلمانوں کے افلاس کا علاج منجانب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۲۔

اس وقت گورنر بنگال کے گورنمنٹ اسکولوں کی زبان ہندوؤں کی زبان تھی اور ماسٹر ہندو تھے۔ اعلیٰ طبقہ کے مسلمان، بت پرستوں کی زبان میں تعلیم پانا گوارا نہ کرسکتے تھے اور پھر اس پر اضافہ یہ ہوا کہ بقول سرولیم ہنٹر ہندو استاذ اس قدر کمزور اور بزدل تھا کہ بچوں میں انتظام قائم نہ رکھ سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے کسی حیثیت کا مسلمان اپنے بچے کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنا گوارہ نہ کرتا تھا۔ [1]

ان اُمور کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۶۰–۹۲ء تک بقول سرولیم ہنٹر اس زمانہ کے اسکولوں میں دس ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان طالب علم ہوتا تھا۔ [2]

لیکن حصول تعلیم کے اس قدر موانع کے باوجود بھی مسلمان انگریزی پڑھ کر کچھ نہ کچھ ملازمت پانے کے مستحق بن جاتے تھے۔ مگر تعلیمیافتہ مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ بعض جگہ ملازمت پانے سے ممنوع کردیا گیا۔ اس بارہ میں سرولیم ہنٹر نے کلکتہ کے ایک فارسی اخبار مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۸۶۹ء کے حوالہ سے لکھا ہے۔

اس خبر کی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں اُن پر سوائے ہندو کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے گا۔ صفحہ ۱۵۵ ۱۲

اس خبر کو درج کرکے ہنٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی اہلیت بھی حاصل کرلیتے ہیں تب بھی انھیں سرکاری اعلانات کے ذریعے

---

[1] و [2] مسلمانوں کے افلاس کا علاج منجانب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس [illegible]

خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے انکی بیکسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی کسر شان سمجھتے ہیں ص ۱۵۸

حکام کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول سر ولیم ہنٹر

سنہ ۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جس میں بجز چپراسی یا یا چھٹی رساں یا دفتری کے مسلمان کو کوئی نوکری مل سکے۔ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو مسلمانوں کے افلاس کا علاج منجانب آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس سنہ ۱۹۳۴ء)

مختصر یہ کہ ہندوؤں کو بڑھایا گیا ان میں تعلیمی اور دفتری قابلیت پیدا کی گئی سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی کر دی گئی اسکولوں میں پادریوں کے زیر پرستی انجیل کو داخل کورس کیا گیا۔ خاص خاص تدبیروں اور خفیہ سرکاروں کے ذریعہ مسلمانوں کو ملازمتوں سے روکا گیا۔ یہ تھے مسلمانوں کے تنزل اور ان کی بربادی کے حقیقی اسباب جنکی ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی کے تنگ نظر اور متعصب عہدداروں پر عائد ہوتی ہے۔ مگر افسوس، بدنام کیا گیا علماء ملت کو جن کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ خوددار، غیور، آزاد منش واقع ہوئے تھے جو آخر تک مسلمانوں کی آزادی و برتری کے لئے قربانیاں پیش کرتے رہے۔

آخر میں ہم مس مئو کے ایک بیان پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اس کے پھل سے اب ہم متمتع ہو رہے ہیں یہ عدالتوں کی زبان کی تبدیلی تھی جو ابتدا میں معمولی معلوم ہوتی تھی مگر اس کی مثال ایسی تھی جیسے کسی تن آور درخت پر کلہاڑی لگائی جائے۔ ؎

؎ مادر ہند ص ۲۸۹ بحوالہ حکومت خود اختیاری ص ۹۷ - ۱۲

ردِّ عیسائیت کے متعلق علماء کی تبلیغی خدمات

بے شک ۱۸۵۷ء کے بعد سرسیّد صاحب نے بھی ردِّ عیسائیت کی طرف توجہ مبذول فرمائی جس کی نوعیت کے متعلق ہم انشاء اللہ آئندہ کچھ تحریر کریں گے۔ لیکن اس وقت کہ ردِّ عیسائیت کے متعلق لب کشائی کرنا اغراضِ حکومت کے مقابلہ پر علانیہ بغاوت تھی۔ یہی علماءِ ملت تھے جو میدان میں آئے اور جس بامردی اور استقلال سے مقابلہ کیا اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ[1] سے ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی شوکت و سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شاہانِ مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ مرحوم زوالِ سلطنت کا پُر حسرت منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اِس پُر خطر زمانہ میں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ایک فاضل مسیح پادری "فنڈر" عوام الناس کے سامنے دینِ عیسوی کی خوبیوں اور بزعم خود اسلام کی کمزوریوں پر تقریر کیا کرتا تھا۔

پادری فنڈر تنہا نہ تھا بلکہ لندن سے اس کے ساتھ مسیحی مبلغین اور پادریوں کی ایک کافی جماعت تھی جو اس امر کا بیڑا اٹھا کر ہندوستان آئی تھی کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت یہاں اس طرح کرے کہ اسلامی سلطنت کے زوال کے ساتھ اسلام بھی مغلوب ہو۔ اور مسیحیوں کے غلبہ اور اقتدار کے ہمدوش مذہب عیسوی بھی ہندوستان کی نرم اور اثر پذیر زمین میں جڑیں پھیلا دے

---

[1] یہ واقعہ مدرسہ صولتیہ ہندیہ کی رپورٹ بابت عام ۱۳۵۸ھ سے نقل کیا گیا ہے۔ مولانا محمد سلیم صاحب نائب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے شائع فرمایا۔

مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی کیرانوی جو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی اولاد سے تھے اور اس وقت خاندان ولی الٰہی کے سلسلے میں منسلک ہوکر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے۔ پادری "فنڈر" کے مقابلہ کے لئے مامور فرمائے گئے۔

مولانا موصوف نے پادری فنڈر سے خط وکتابت کرکے اسکی علمی قابلیت کا اندازہ کیا اور پھر اس کو مناظرہ کا چیلنج دیا۔ معزز ہندو مسلمان اور انگریز مناظرہ کے حکم اور پنچ قرار دیئے گئے۔

چنانچہ تمام ابتدائی مراحل طے ہو جانے کے بعد اکبر آباد "آگرہ" میں مناظرہ قرار پایا۔ جو ماہ رجب ۱۲۷۰ھ میں (یعنی ۱۸۵۷ء سے تقریباً چار برس پیشتر) اسلام وعیسائیت کی صداقت کے درمیان فیصلہ کن اور تاریخ ہندوستان میں ان دونوں کے تصادم کا پہلا واقعہ اور عظیم الشان مناظرہ تھا۔

مولانا محمد رحمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غیبی امداد اور تائید الٰہی کے ساتھ اپنی خداداد قابلیت اور تبحر علمی سے تین روز کے متواتر جلسوں میں اس امر کو ثابت کردیا کہ موجودہ انجیل جس پر آج عیسائیوں اور پادریوں کو ناز ہے تحریف شدہ ہے۔

فاضل مسیح سے اس عام جلسہ میں بجز تسلیم کے کچھ نہ بن پڑا۔ اس لاجواب مسئلہ میں لاجواب ہو جانے پر پادری فنڈر اسی روز شب کی تاریکی میں ایسا چھپا کہ آگرہ بلکہ ہندوستان بھر میں پھر نظر نہیں آیا۔ چوتھے روز حسب عادت جلسہ منعقد ہوا علم اور شرکار جلسہ سب جمع ہوئے مگر فاضل مسیح غائب تھا

اس وقت یہ راز طشت از بام ہوا کہ سیاہ شب نے لارڈ بشپ کی پردہ داری کی مجبوراً ان ججوں کو جو طرفین کی طرف سے حکم قرار پائے تھے عیسائیت کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا۔

اس مناظرہ کی پوری کیفیت کو اسی زمانہ میں ایک غیور مسلمان نے آگرہ میں چھپوا کر شائع کر دیا تھا۔ پادریوں نے اس مطبوعہ رسالہ کو خاص اہتمام سے خرید کر ضائع کرنے کی کوشش کی۔ مگر پھر بھی ہندوستان کے بعض علمی گھرانوں اور قدیم کتب خانوں میں اس عدیم المثال مناظرہ کا مطبوعہ رسالہ محفوظ ہوگا حضرت مولانا مرحوم نے اس مناظرہ کے بعد اس فتنہ کے بالکلیہ استیصال اور روک تھام کی غرض سے جو کتابیں ردِ نصاریٰ میں تصنیف و تالیف فرمائیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) اظہارِ حق۔ خلیفۃ المسلمین سلطان عبد العزیز خاں کی خواہش اور خیر الدین پاشا تونسی صدر اعظم کی تحریک پر تصنیف کیا گیا۔ اس میں پادری فنڈر سے آگرہ میں مناظرہ کی تفصیلی کیفیت اور تمام مسائل کا نہایت بسط و تشریح کے ساتھ بیان ہے۔ قسطنطنیہ میں لکھی گئی اور سب سے پہلے قسطنطنیہ میں چھپی۔ صدر اعظم موصوف کے حکم سے ایک ترک عالم نے عربی سے ترکی میں ترجمہ کیا اور ابراز الحق کے نام سے مکمل ترکی ترجمہ شائع ہوا۔ نیز یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت عثمانیہ کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کئے گئے جسے پادریوں نے خاص اہتمام اور کوششوں سے تلف کیا۔ مصر میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ مولوی سلیم اللہ صاحب نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ مولوی غلام محمد

صاحب بھانجار اندیری نے بڑی محنت و جانکاہی سے گجراتی میں ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

۱۸۹۱ء میں انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا جس کے بعد "ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔ نواب حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ نے مکہ معظمہ میں مولانا مرحوم کو ٹائمز کا یہ تراشہ اور اظہار الحق کے متعلق اس کا مذکورہ بالا ریویو خاص اہتمام سے دیا تھا۔

(۲) ازالۃ الاوہام (۱۲۶۹ھ میں ۵۰۴ صفحات اور بڑی تقطیع پر دہلی میں طبع ہوئی)

(۳) ازالۃ الشکوک (۱۲۶۹ھ میں مولانا مرحوم نے تصنیف فرمائی۔ دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے)

(۴) اعجاز عیسوی (اس کتاب میں مولانا مرحوم نے کامل طور پر بائیبل کا غیر معتبر اور محرف ہونا ثابت کیا ہے۔ پہلی بار آگرہ میں اور دوسری بار مطبع رضوی دہلی میں شائع ہوئی)

(۵) اصح الاحادیث فی ابطال التثلیث (دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے تثلیث کو باطل کیا ہے۔ مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی)

(۶) بروق لامعہ۔ (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ پر ختم نبوت کا مدلل اثبات) (غیر مطبوعہ)

(۷) البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف (۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی

تحریف الانجیل پر محققانہ بحث ہے (مطبوعہ قمر المطابع دہلی)

(۸) معدل اعوجاج المیزان (یہ کتاب میزان الحق۔ مؤلفہ پادری فنڈر کا جواب ہے نایاب ہے)

(۹) تقلیب المطاعن۔ "یہ کتاب" دین حق مصنفہ پادری "المند" کا رد اور جواب ہے)

(۱۰) معیار التحقیق۔ کتاب "تحقیق الایمان" مصنفہ پادری صفدر علی کا دنداں شکن جواب ہے۔

(۳) ہندوستانیوں کو لامذہب بنایا جائے

تعلیم کے متعلق مذکورہ بالا دو پالیسیاں وہ تھیں جن پر یکے بعد دیگرے عمل ہوتا رہا۔ مگر تقریباً ناکام رہیں۔ اگرچہ ہندوستانیوں کو بہت کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ تحریر سابق سے اجمالی طور پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان پالیسیوں کے ناکام کرنے اور ہندوستانیوں کو ان کے مہلک اثرات سے نجات دلانے کا سہرا اگر باندھا جا سکتا ہے تو صرف علماء ملت کے مبارک سروں پر۔

بہر حال اب تیسری پالیسی بروئے کار آئی۔ جس کا سلسلہ اگرچہ ابتدا ہی سے چل رہا تھا مگر چونکہ ۱۸۷۰ء تک انگریز کی پالیسی یہی تھی کہ مسلمان کو پیچھے رکھا جائے لہٰذا جس قدر مسلمانوں میں تعلیم کی کمی رہی۔ اس پالیسی کا اثر بھی مسلمانوں پر کم پڑا۔

تیسری پالیسی ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۸۷۱ء میں گورنمنٹ ہند نے مسلمانوں کے بارہ میں اپنی پالیسی بدل کر ۷ راگست ۱۸۷۱ء کو مختلف صوبجات کے پاس احکام بھیجے جن کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے۔ گورنمنٹ اسکولوں میں مسلمانوں کی قدیم زبانوں اور نیز دیسی زبانوں کی تعلیم جاری کی جائے مسلمان استاذ مقرر کئے جائیں اردو اور انگریزی کے جدید اسکولوں کو مالی امداد دی جائے مسلمانوں کی دیسی زبان کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ یونیورسٹیوں میں عربی فارسی تعلیم کا اضافہ کیا جائے۔ [1]

اس کے بعد اگرچہ عم محترم مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم کو نیز آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو یہی شکایت ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے بار بار کمیٹیاں ہوتی رہیں اور مسلمانوں کے متعلق اس قسم کی سفارشات کرتی رہیں مگر خاطر خواہ نتیجہ اب تک برآمد نہیں ہو سکا۔ کیونکہ گورنمنٹ کی کوتاہی اور کچھ ہندوؤں کا ذہنی اقتدار ان سفارشات کی تکمیل میں آڑے آتا رہا۔

مگر ہمیں اس موقع پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف جسقدر توجہ بھی کی گئی اس کا مقصد کیا تھا مسلمانوں پر اس کا اثر کیا ہوا۔ اور علماء ملت نے اس کا تدارک کیا کیا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ لارڈ میکالے نے جب ۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تعلیم دیجانیکی حمایت کی تھی تو اس نے اپنی رپورٹ میں اپنی رائے کی وجہ یہ بیان کی تھی۔

---

[1] تاریخ التعلیم از سید محمود ص۱۴۹ بحوالہ روشن مستقبل ص۲۲۱ ۱۲

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔[۱]

اس کے بعد اب ۱۸۷۰ء میں جب مسلمانوں کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی بدلی تو میجر باسو اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ حکومت نے سمجھ لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو تعلیم اور ملازمت سے نکال کر ان کی ذہنیت نہیں بدل سکتی چنانچہ میجر موصوف لکھتا ہے۔

لارڈ میو وائسرائے ہند نے محسوس کیا کہ تعلیم اور ملازمت سے علیحدگی کی وجہ سے مسلمان ناراض ہیں اور سرحدیوں کو امداد بھیجتے ہیں۔ جہاں سے ہندوستان کو خطرہ رہتا ہے۔[۲]

مسٹر جیمس اوکینیلی، جو مسلمان باغیوں کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا اس نے بھی مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی سفارش کرتے ہوئے یہی دلیل بیان کی تھی۔

اور " ہنری ہیرنگٹن طامس " نے اپنے رسالہ " ہندوستان میں گذشتہ بغاوت اور ہماری آئندہ پالیسی " میں صاف کہا تھا

میں نے پہلے یہی بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک

۱؎ تاریخ التعلیم از میجر باسو صفحہ ۸۸ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۳۰ ۱۲ ۲؎ ہندوستان تاج برطانیہ کے عہد میں از میجر باسو بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۱۲۴ ۱۲

ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہیں کر سکتے تھے اور نہ کرنا چاہتے تھے۔

وہ (مسلمان) خلیفہ اول کے وقت سے موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور و ظالم رہے ہیں۔ ہمیشہ ان کا مقصد یہی رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو۔ اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشو ونما ہو۔ مسلمان ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں (ص ۵۶ حکومت خود اختیاری)

اس قسم کے بہت سے شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا فیصلہ یہی ہو گا کہ اب انگریزی تعلیم کا مقصد قرار دیا گیا کہ

(الف) برطانوی شہنشاہیت کے لئے وفادار کاسہ لیس پیدا کئے جائیں۔

(ب) چونکہ احکام قرآن کی موجودگی میں برطانوی شہنشاہیت سے وفاداری ممکن نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو مذہب سے نا آشنا بنایا جائے۔

(ج) نصاب تعلیم ایسا ہو کہ پڑھنے والے برطانوی شہنشاہیت کے لئے ایماندار غلام بن جائیں۔ یعنی احترام مذہب، احساس وطن، احترام علماء اور باہمی رواداری سے محروم کر دیئے جائیں۔ آپس میں تفریق بڑھے۔ ہندو مسلم منازعت پیدا ہو اور تفرقہ ڈالو حکومت کرو کی پالیسی کامیاب ہو۔

بیشک آج سے ستر سال بیشتر ہمارے بزرگ نہیں پہچان سکے کہ تعلیم کے متعلق مسلمانوں کی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ لیکن آج ہمیں اجازت دی جائے کہ محبانِ

وطن سے فتویٰ طلب کریں کہ ایسی تعلیم اور اس کی ترویج و اشاعت جائز ہے یا ناجائز۔ بینوا توجروا۔

فریب خوردہ عقلمند
مسلمانوں کے نادان دوست یا دانا دشمن

سرسید احمد خاں مرحوم کی جدوجہد۔ جفاکشی اور قربانیاں کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر آپ کی تمام جدّوجہد انگریز کے نقطۂ نظر کے عین مطابق ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی کے بعد جب مسلمانوں کو کچھ ہوش آیا تو بلاشبہ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ حکومت ختم ہوچکی تھی۔ صنعت ۱۸۱۱ء سے پہلے برباد کی جاچکی تھی۔ املاک و جائیدادیں ضبط کی جاچکی تھیں۔ سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی قرار دیجاچکی تھی۔ یعنی آجتک کے علماء جاہل قرار دیئے گئے تھے۔ بڑے بڑے محدث اعلیٰ سے اعلیٰ ادیب بہترین فلسفی اور کامل ترین محاسب اور ریاضی داں کی قدر انگریز کی نظر میں ایک دیہاتی جاہل سے زیادہ نہ رہی تھی۔

ہندوؤں کو بڑھانے کی پالیسی پر شدت سے عمل کیا جارہا تھا۔ مسلمانوں کو مشتعل کرنے والی چیزیں نظام تعلیم کا جزو بنائی گئی تھیں اس طرح ان کو جدید تعلیم سے روکا جارہا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس وقت وہ ملازمت سے محروم تھے بلاشبہ مفکرین ملت کا فرض تھا کہ مستقبل کے متعلق فکر کرتے اور ہندوستان میں

باعزت زندگی کی سبیل سوچتے۔

اس زمانہ میں مفکرین و مدبرین ہند نے کیا کیا۔ اس کی تفصیلات تو آپ روشن مستقبل (مصنفہ مولانا سید طفیل احمد صاحب علیگ) میں ملاحظہ فرمائیں۔ مختصر یہ کہ

(الف) یہ تو بالاتفاق تسلیم کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ کا قائم کیا ہوا نظام مسلمانوں کی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا۔ اسلامی کلچر کے لئے تباہ کن ہے اور ان کے عقائد پر برا اثر ڈالتا ہے۔

(ب) مگر تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دو خیال تھے۔ اول یہ کہ حکومت ہی سے نظام تعلیم کی اصلاح کا مطالبہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا ذمہ دار حکومت ہی کو قرار دیا جائے تاکہ حکومت ہند جو روپیہ تعلیمی شعبوں پر خرچ کرے وہ صرف ہندوؤں ہی کے لئے نہ ہو جائے۔ بلکہ مسلمان بھی اپنا حق وصول کرتے رہیں۔ دوسری رائے یہ تھی کہ تعلیمی نظام مسلمان اپنے طور سے اپنی ذمہ داری پر قائم کریں گورنمنٹ سے صرف امداد لیتے رہیں۔

بدقسمتی سے سرسید صاحب اور ان کی پارٹی کی رائے یہی تھی اور یہی ثانی الذکر رائے قابل عمل قرار دی گئی۔

(ج) طریق تعلیم پر بحث شروع ہوئی تو مسلمان کی بدقسمتی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ سرسید صاحب کی رائے یہ تھی کہ مسلمان انگریزی معاشرت اور انگریزی کلچر اختیار کرلیں تاکہ انگریز کی نظر میں وہ عزت حاصل کرسکیں۔ چنانچہ مصنف روشن مستقبل تحریر فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کے لئے سرسید نے دو طریقے اختیار کئے
اول اصلاح معاشرت اور دوسرے اصلاح مذاہب۔ اصلاح معاشرت کیلئے
سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے انگریزی تمدن اختیار کر لیا تھا۔ اور انگریزوں
کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔ جو ہندو مسلمانوں کو ناگوار تھا۔ مگر انگلستان سے
لوٹ کر سرسید نے یہ اضافہ کیا کہ اس کام کی باقاعدہ تبلیغ شروع کر دی۔ یہی طریقہ
ترکوں نے بھی اپنے ملک میں جاری کیا تھا۔ اس لئے سرسید کو اپنے خیالات میں
بہت تقویت ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ نے تہذیب الاخلاق میں لکھا۔

ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپیوں کے بالکل یوروپین ہے۔ سب نے زمین پر
بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ میز و کرسی پر بیٹھتے ہیں میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے
ہیں۔ ان کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یوروپین جیسا ہے۔ جب ترک
اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو مجہولی معلوم ہوتے
ہیں۔ اور امید ہے کہ روز بروز مہذب ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان
کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصبات اور خیالات خام کو
چھوڑ دیں اور تربیت اور شائستگی میں قدم بڑھائیں۔ [1]

مندرجہ بالا نظریہ کے مطابق عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں
چونکہ ان کا ذبیحہ مانع تھا۔ اس لئے سرسید نے مسلمانوں کے لئے گردن مروڑی
مرغی کا کھانا جائز قرار دیا۔ جوتہ پہنکر نماز پڑھنا عام طور پر معیوب مانا جاتا تھا

---

[1] روشن مستقبل صفحہ ۱۸۱ و صفحہ ۱۸۶۔ ۱۲

کھڑے ہوکر پیشاب کرنا اور ڈاڑھی منڈوانا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سب چیزوں کے جواز کو سرسید نے مذہب سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ۵ٓ

اس سے انکار نہیں کہ ردّ عیسائیت میں سرسید نے کچھ تحریریں شائع کیں جن پر سرسید کے پیروکار آجتک فخر کرتے ہیں۔ مگر انصاف پسند حضرات ہمارے اس خیال کی ضرور تائید کریں گے کہ سرسید کے طرز جواب نے مسلمانوں کے دلوں سے، حدیث، قرآن پاک، مذہب اور علما کے احترام کو کافور کردیا۔

سرسید کی تصنیفات کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ سرسید کسی اعتراض کا جواب قرآن پاک اور احادیث کی روشنی میں نہیں دیتے۔ بلکہ جواب کا ڈھانچہ اپنی عقل سے تراشتے ہیں اور پھر توڑ مروڑ کر احادیث اور آیات کو اُس اختراعی تخیل پر منطبق کرتے ہیں اور اس طرح عیسائیوں اور ملحدوں کے اُس اعتراض کو تسلیم کرلیتے ہیں کہ احکام اسلام نیچر اور اصول فطرت کے خلاف ہیں۔ تقاضا وقت کو پورا کرنے سے ناقص اور اوہام پر مبنی ہیں (معاذ اللہ)۔

واقعہ یہ ہے کہ شریعت اسلام کی صداقت ہر ایک اعتراض سے پاک ہے اعتراض کرنے والے اُس صداقت کی روشنی تک یا تو پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے یا جان بوجھ کر نادانی کی دھول ڈالتے ہیں اور روشن نور کو باطل کی تاریک چادروں میں چھپا کر دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔

۱۔ حقیقی اور اصلی جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ باطل کی چادروں کو

۵ٓ روشن مستقبل صـ۱۸۱ - ۱۲

چاک کرکے شریعت اسلام کے اصول اور اس کے سچے صادق منشا کو واضح کر دیا جائے۔

مگر بلاشبہ اس کے لئے وسیع علم اور کافی تبحر کی ضرورت ہے۔

چنانچہ مولانا محمد رحمت اللہ صاحب اور دیگر اکابر علمار محققین، جن کے نام سے بڑے بڑے پادری لرزتے رہے اور جن کی تصانیف کے ترجمے دنیا کی بہت سی زبانوں میں شائع کئے گئے۔ ان کا طرز یہی تھا۔

مذہب کے کسی معمولی جزئیہ کو تبدیل کئے بدون دنداں شکن جوابات سے اعتراض کرنے والوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ مگر سر سید صاحب نے اپنی عقل کو اپنا رہبر بنا کر تحقیق و تدقیق سے بے خبر ہو کر الٹے سیدھے جوابات سے کتابوں کو پُر کر دیا۔

سرسید کے ملنے والے حضرات ان جوابات سے بیشک خوش ہوئے مگر علمار ملت کے نزدیک وہ جوابات سراسر اعتراضات تھے۔ علمار ملت نے سرسید کو تنبیہ کی تو یہ ان کے عالی دماغ کے لئے انتہا درجہ توہین تھی۔ بھلا جو سر انگریزوں کی چوکھٹوں پر رگڑا جائے اور حریم لندن کے طواف سے دماغ روشن کر چکا ہو۔ اس کے لئے کب ممکن تھا کہ کوئی بات غلط کہہ سکتا۔

چنانچہ علمار کرام کی تنبیہ پر نہ صرف یہ کہ علمار ہی کو مغلظات سنائیں بلکہ معاذ اللہ احادیث کو غیر قابلِ اعتبار، تمام قدیم مفسرین کی روایات کو لغو اور بے ہودہ قرار دیا۔ اور انھیں علمار یہود کا نہ صرف مقلد بلکہ اُن سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا بتایا اور لکھا کہ ہمارے مفسرین نے ایسے ناپاک طریقے سے فلاں مسئلہ کو محمول کیا ہے

کہ بجز اس کے کہ خدا انھیں معاف کرے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا [1]

اُسی کے ساتھ سرسید نے اپنی ذاتی رائے کی نسبت یہ دعویٰ کیا کہ ہمارے سوائے تمام مفسرین اور علمار متقدمین (فلاں) آیت کے معنی اُلٹے سمجھے مگر اس کہنے کی ہمیں پرواہ نہیں۔ [2]

خدارا بتایا جائے کہ کیا اس طرز جواب سے کوئی اسلام کی خدمت ہوئی یا اسلام دنیا کی نظر میں اور بھی زیادہ حقیر کیا گیا کہ اس کے ساڑھے بارہ سو سال کے مفسر، علمار اور فقہا اس درجہ غبی اور نادان گذرے ہیں کہ صحیح بات نہ سمجھ سکے (العیاذ باللہ)

عجیب لطف یہ تھا کہ اعتراضات انگریزی میں اور ان کے جوابات جن میں علمار ملت، مفسرین، اہلحدیث اور محدثین کا مذاق اُڑایا جاتا تھا وہ اردو میں۔

"سر ولیم میور" نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح انگریزی میں لکھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کئے۔

مگر سرسید نے اس کے جوابات میں "خطبات احمدیہ" اردو میں لکھ کر کھلے طور پر لامذہبی اور بے دینی کی تعلیم دی۔ یعنی مذہب کے نام پر لامذہبی کی تعلیم۔ اور مذہب سے متنفر کرنے کی جو اسکیم انگریز کے دماغ میں تھی۔ سرسید نے جان بوجھ کر یا نادانی سے اس طرح اس اسکیم کی تکمیل کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں (افسوس) ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

آج ہم غلام احمد بیگ قادیانی کو برا کہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم

---

[1] تفسیر سرسید جلد چہارم صفحہ ۱۶۱ – ۱۲ [2] تفسیر سرسید احمد جلد دوم صفحہ ۱۱۱ – ۱۲

کے تمام دجالوں کی رہنمائی سرسید نے کی۔[1]

سرسید ہی نے ہندوستان میں یہ طریقہ رائج کیا کہ قرآن کے وہ معنی کرو جو دل کو بھائیں۔ اور احادیث میں سے صرف ان احادیث کو صحیح مانو جو مطلب کے موافق ہوں اور باقی سب کا انکار کر دو۔

اس پر جب علماءِ ملت نے احتجاج کیا تو جدید تہذیب کے مہذب دیوتا نے ان پاکباز فدایان ملت کے لئے وہ الفاظ تراشے جن پر انسانیت بھی نفرت کرتی ہے۔

احمق۔ ناعاقبت اندیش۔ مُردوں کی روٹیاں کھانے والے۔ فاتحہ درود سے شکم پُری کرنے والے۔ مجسم شمسل۔ اندھے مقلد وغیرہ وغیرہ۔ خطابات اُن اکابر علما کے لئے تجویز کئے جو خود بھی فاتحہ درود، مُردوں کی روٹیوں اور اس قسم کے بیجا مصارف کے سختی سے مخالف تھے اور سو سال پیشتر سے ان رسوماتِ قبیحہ کے برخلاف جہاد کر رہے تھے۔ اور سرسید سے کہیں زیادہ ان مراسم کی اصلاح کر چکے تھے حتیٰ کہ انگریزی الہامات کے بموجب مسلمانوں نے اُن کا نام وہابی رکھ چھوڑا تھا۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ سرسید کی رائے اور ان کی جدوجہد صرف اسی نقطہ پر منحصر ہو گئی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزی تربیت بھی ہو۔ علماءِ سنت کو سرسید کے اس نظریہ سے سختی سے اختلاف تھا۔

ورنہ علماءِ کرام حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بھی اس پر

---

[1] حیات جاوید کے بیان کے بموجب سید صاحب کا نسبی تعلق ان امام شاہیوں سے تھا جو خاندان ولی اللہ کی اصلاحی کوشش کو ناکام کرنے میں سرگرم رہے۔ محمد میاں

آمادہ تھے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی طور پر اسلامی تعلیمات کا انتظام کر دیا جائے۔ (ملاحظہ ہو روشن مستقبل صہ ۲۰۴)

نتیجہ کلام | آپ سرسید صاحب کے اس تمام اصرار اور ضد کو ملاحظہ فرمایئے جس پر انہوں نے اپنی آخری جد و جہد صرف کر دی۔ حتیٰ کہ اسی میں ان کی وفات ہوئی۔ پھر لارڈ میکالے کے اس نظریہ کو ملاحظہ فرمایئے۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو۔ مگر مذاق اور رائے۔ الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔" [1]

اس کے بعد آپ غور فرمایئے کہ کس طرح مسلمانوں نے اپنے ہی ہاتھوں گورنمنٹ کی منشا کو پورا کیا حتیٰ کہ مہربان گورنمنٹ کو اس کا ذمہ دار بننا بھی گوارا نہ کیا۔

تعجب ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کس طرح برٹش امپیریلزم کی نظر میں اتنا معزز اور محبوب ہوا کہ صرف اس کے خطابات ہی ایک داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال بظاہر صحیح ہے کہ اس حیثیت کا کوئی ہندوستانی برطانی ملوکیت سے اتنے خطابات حاصل نہیں کر سکا۔

بہرحال تہذیب اور متانت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم آنریبل ڈاکٹر سرسید احمد خاں صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ایف۔ آر۔

---

[1] تاریخ التعلیم میجر باسو صہ ۸۰ بحوالہ روشن مستقبل صہ ۱۳۷، ۱۲

ایس، کا نام عزت سے لیں۔

لیکن افسوس ہے کہ تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی اپنے زمانہ میں انسان بسا اوقات صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر سکتا، مگر نتائج بہت جلد کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کر کے عالم آشکار کر دیا کرتے ہیں۔

زمانہ حال ماضی کا ثمرہ ہے اور مستقبل کے لئے ایک تخم کی حیثیت رکھتا ہے ہمیں آج اپنے پیش رو حضرات کے اعمال کا محاسبہ کرنا ہے اس لئے نہیں کہ ہم ان کو مطعون کریں بلکہ اس لئے کہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کے لئے شاہ راہ عمل تلاش کریں۔

قیام دار العلوم دیوبند

سلطنت مغلیہ کے آخری چراغ کو گل ہوئے ۱۳ سال گزر گئے۔ ہندو اور مسلمان حریت اور استخلاص وطن کی آخری جدوجہد میں ناکام ہو چکے۔ سبز رنگ کا قومی نشان صلیبی نشان کے سامنے سرنگوں ہو چکا۔ دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم کے بجائے یونین جیک لہرا رہا ہے۔ ایک ایک کر کے ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا جلاوطن کر دیا گیا جس نے تحریک حریت میں کوئی بھی جدوجہد کی تھی۔ سیکڑوں علماء ہیں جنھوں نے دار و رسن کی مظلومانہ موت کو لبیک کہا۔ اور جام شہادت پی کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

ہزاروں خاندان ہیں جو جاہ وجلال کی سربلندیوں کے بجائے بے کسی،

تباہی اور خانہ بربادی کی بستیوں میں گر گر ان الملوک[1] اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ کے فطری اصول کا تختۂ مشق بن چکے۔

مختصر یہ کہ انقلاب کی تباہ کاریوں نے مسلمانوں کو اس درجہ ہیبس ڈالا کہ عمل تو درکنار سیاست کے نام سے بھی وہ لرزنے لگے۔

خفیہ[2] پولیس کے انسانیت سوز کارناموں نے اوقات سحر میں بھی بددعا کو موت کے مرادف بنا دیا۔

ہندوستان کے طول وعرض پر عیسیٰ مسیح کے مذہب کا جھنڈا لہرانے کے شوق میں عیسائی اور مسلم نما پادری سانپ بچھو کی طرح ظلمت کدہ ہند کے چپہ چپہ میں رینگنے لگے۔ نظام تعلیم کی تباہی نے ایک عام جہالت کی چادر تمام ہندوستان پر تان دی۔ شاہ عالم کے معاہدہ کے برخلاف حکومت کی زبان انگریزی قرار دیکر عربی اور فارسی کے تمام مکاتب ومدارس کو پیغام فنا سنا دیا گیا۔ علماء امت کو دیہاتی جاہل سے بھی زیادہ بے حیثیت کر دیا گیا۔ اسکولوں اور کالجوں کا کورس وہ تجویز کیا گیا جو مسلمان بچوں کو عیسائی نہ بنا سکے تو کم از کم ان کی رائے میں اتنی تبدیلی ضرور پیدا کر دے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں۔

ایک مصیبت تھی، تباہی تھی جس میں مسلمانانِ ہند پہلی مرتبہ مبتلا ہوئے تھے

---

[1] ملوک (بادشاہ) جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو برباد اور اس کے باعزت باشندوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں [2] دیوبند کے ایک بڑے میاں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں تہجد سے فارغ ہو کر انگریزوں کے لئے بددعا کرتا ہوں مگر میں بددعا سے پیشتر سارے مکان پر اور در و دیوار پر نظر ڈال لیتا ہوں کہ کوئی اجنبی شخص تو یہاں موجود نہیں ۱۲ (مؤلف)

تمام چارے ختم ہو گئے تھے۔ تقدیر تدبیر پر غالب آچکی تھی۔

حیرانی تھی کہ جب شجر اسلام کی آبیاری نہ ہو تو اسلام سوز باد سموم کے تیز و تند جھونکوں میں اس نخل نو کا بقا کہاں تک۔ [1]

ہاں کچھ وہ بھی تھے کہ ان کے مقدس ایمان کے نور فراست نے دیدۂ بصیرت کو اس قدر تیز کر دیا تھا کہ مستقبل بعید کو اپنے تدبر و تفکر کے آئینہ میں حال کی طرح دیکھ رہے تھے۔

دشمنان اسلام اگرچہ اسلام کے فنا کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن اسلام اپنے پاکبازوں کے ذریعہ سے اپنا اعجاز دکھانا چاہ رہا تھا اور بلاشبہ وہ ایک جدید حیات کے لئے مچل رہا تھا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ؎ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

ان ہی پاکبازوں کی پیشانیاں سربسجود ہوئیں۔ اوقات سحر میں قاضی الحاجات کی بارگاہ میں دست دعا بلند کئے گئے۔ ان کے تضرع اور ابتہال پر لطف الٰہی کا ترشح سرزمین ہند کی طرف منعطف ہوا۔ اور ہندوستان میں تحفظ اسلام کی ایک

---

[1] گذشتہ ابواب کے مطالعہ سے واضح ہو گیا کہ اس تاریک دور میں سیاست اور مذہب کا سب سے بڑا مطالبہ یہی تھا کہ ملت اسلامیہ کو ڈاکوؤں اور رہزنوں اور ایسے افراد سے بچایا جائے جو مار آستین ہوں۔ اور ایک ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس کے ذریعہ مسلمان مسلمان رہ سکے۔ یہی وقت کا اہم ترین فرض تھا۔ اگر مسلمان مسلمان ہوگا اسلام اسلام ہوگا تو دنیا کے انقلابات میں کبھی وہ بازی لیجائیگا۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔ لیکن اگر مسلمان مسلمان نہ رہے الحاد اور زندقہ کا نام اسلام رکھ دیا جائے تو پھر جو بھی ترقی ہوگی وہ اسلام کی ترقی نہ ہوگی کفر و الحاد و زندقہ کی ترقی ہوگی۔ نعوذ باللہ من ان نضِلَّ و نُضَلَّ۔

تجویز پر عملدر آمد شروع ہوگیا۔ یوں کہو رسالت عظمیٰ کے عہد مقدس کا ایک صفحہ ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

تجویز کردہ لائحہ عمل!

سیاست کے نام پر کوئی تحریک انگریزی پالٹیکس میں حرام تھی۔ تنظیم قوم اول تو خود خطرناک چیز تھی۔ پھر کسی مقصد کے بغیر تنظیم ناممکن۔ تنظیم بذاتِ خود بھی بھی کامیاب نہیں۔ ہاں کوئی مقصد خود بخود نظم پیدا کر دیا کرتا ہے۔ محض وعظ و تبلیغ یا فتویٰ نویسی موجودہ نسلوں کے لئے مفید ہو جاتی ہے۔ مگر آئندہ کے لیے ان چیزوں میں تحفظ ملت کی کوئی قوت نہیں۔

ہاں ایک چیز اور صرف ایک چیز تھی جس کا نقشہ عہد رسالت (علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) میں صفہ کی صورت میں نظر آیا تھا۔

اب اس کو مدرسہ کی شکل دی گئی

یعنی محض اللہ کے توکل پر مذہبی مدارس کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے جو مسلمانوں کو مسلمان اور اسلام کو اپنی حقیقت کے ساتھ باقی رکھ سکے۔

انگریزی کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں ایسے مدارس کا قیام نہایت دشوار تھا۔ کیونکہ زمانہ کا انقلاب۔ طبائع کا تغیر۔ انگریز کا اقتدار ایسے مدارس کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

علاوہ ازیں گورنمنٹ سے اس کا تعلق یہ معنی رکھتا تھا کہ انگریزی منشا کے بموجب مذہب کو مسخ کرنے کی ایک مشین بنائی جائے۔

لیکن ان مقدس اکابر نے تحفظ ملت اور بقاء اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی، جفاکشی، فاقہ مستی اور ایثار کو منظور کیا اور محض اللہ پر بھروسہ کر کے خاندان ولی اللہی کے جانشینوں نے سرزمین دیوبند - سہارن پور اور پھر مرادآباد کی طرف عنانِ جد و جہد کو منعطف کیا۔

دیوبند میں دارالعلوم - سہارن پور میں مظاہر العلوم - مرادآباد میں مدرسہ قاسم العلوم عرف مدرسہ شاہی قائم کیا گیا۔

ایک عجب کرشمہ ہے کہ ان مدارس میں دارالعلوم نے مرکزیت کی شان حاصل کر لی اور واقعہ تو یہ ہے کہ وہ عظمت حاصل کی جس کی نظیر سے مسلمانوں کی تاریخ خالی ہے۔

بیشک ہندوستان میں گیارہ سو برس مسلمانوں کی شان دار حکومت قائم رہی مگر کیا کوئی درسگاہ ملتی ہے جس میں اہتمام کے ساتھ حدیث و تفسیر کی تعلیم ہوتی ہو۔ بیشک مدارس لاکھوں تھے چپہ چپہ پر اسکول تھا۔ مگر افسوس ہندوستان کے طول و عرض میں دارالحدیث یا دارالتفسیر ایک بھی نہ تھا۔ ہاں بیشک مصر و بغداد میں بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جامع ازہر آج بھی اپنی جامعیت میں شہرۂ آفاق ہے۔ لیکن ان تمام کا قیام و بقا حکومت کے خزانوں پر تھا۔

سوال تو یہ ہے کہ بیکس و بے درماں مفلس قوم کا مدرسہ جو اپنی خدمات میں جامع ازہر، جامعہ نظامیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے بازی لیجائے۔ کیا اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے کہیں وجود میں آیا ہے۔ بلاشبہ یہ اسلام کا ایک معجزہ ہے جو سرزمین ہند میں ظاہر ہوا اور جس نے تمام عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

دار العلوم دیوبند کے اصول و مقاصد

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے قلم کے تحریر فرمودہ اصول[1] رسالہ القاسم کے دار العلوم نمبر (مجریہ ۱۳۴۷ھ) میں شائع ہوئے ہیں۔

اِن اصول کی بِنا پر بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ دار العلوم اور اس کے ہم صنف دیگر مدارس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(الف) آزادی ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلا ہو۔ کوئی سنہری طمع مربیانہ دباؤ یا سرپرستانہ مراعلت اس میں حائل نہ ہو سکے۔

(ب) اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر

---

[1] یہ اصول آٹھ ہیں۔ اس میں سے نمبر ۳، ۴، ۶، ۷، ۸ ان صفحات میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔ ۱، ۲، ۵ ہمارے مضمون سے تعلق نہیں رکھتے۔ تکمیل فائدہ کے لئے ان کو درج کیا جاتا ہے۔ ۱ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔ ۲ ابقاء طعام طلبہ بلکہ افزائش طلباء میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۵ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز جو شوریٰ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا۔ اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔ ۱۲

قائم رکھنے میں معین ہو۔ اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لئے ورنہ کم از کم اس وقت تک کے لئے محفوظ ہو جائے۔ جب تک کہ یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے، نیز توکل علی اللہ اور عوام کی طرف سے احتیاج خود کارکنان مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹ ان میں قطعاً نہ پیدا ہو بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے۔ اور اس طرح آپس میں خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔

(مندرجہ بالا (الف) اور (ب) کے لئے ملاحظہ ہو اصول وضوابط کی دفعہ ۶، ۷، ۸ جن کے الفاظ حسب ذیل ہیں)۔

اصل ۶۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا۔ اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

اصل نمبر ۷۔ سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

اصل نمبر ۸۔ تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ

زیادہ پائیداری کا موجب معلوم ہوتا ہے (انتہی)

الحمدللہ کہ دارالعلوم دیوبند متعدد بار لاکھوں روپے سالانہ کی طمع دلانے کے باوجود آج تک گورنمنٹ کے احسان سے آزاد ہے اور مستقبل کے لئے اسی کا عہد کئے ہوئے ہے۔

خداوندا تو اس کے متوسلین کے قلوب کو بھی ہر ایک ناجائز تاثر سے آزاد رکھ۔ (آمین)

(ج) کارکنان، خدام اور مستفیضین کی جماعت جملہ اثرات سے محفوظ اور مامون رہ کر ولی اللہی مسلک پر شدت سے عمل پیرا رہے۔ جس کے متعلق تمام عالم اسلامی کا اتفاق ہے کہ وہ سنت قویمہ ہے۔ مسلک اسلاف کے عین مطابق ہے۔ افراط و تفریط سے پاک۔ صراط مستقیم اور معیار صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو اصل ؎۷ جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"یہ بات نہایت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خودبیں اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں"

(د) خودداری اور استبداد (جو شرعی نیز تاریخی حیثیت سے بربادیٔ مسلم کا واحد ذمہ دار ہے) کے برخلاف باہمی مشاورت سے اجتماعی اور جمہوری حیثیت کے ساتھ کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

چنانچہ اس کے متعلق اصل سوم میں متعدد ضابطوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جن کو ہم نمبروار اصلی الفاظ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

(۱) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو اپنی بات کی پیچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل شوریٰ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے بر وقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ ہو۔ سخن پروری نہ ہو۔

(۲) اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں۔

(۳) سامعین اس کو بہ نیت نیک سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔

(۴) اور نیز اس وجہ سے (یعنی اپنی بات کی پیچ نہ ہو بلکہ مفاد مدرسہ پیش نظر ہو) ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔

(۵) نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں پھر اہل شورہ معترض ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے (جس کو مؤلف نے بعینہٖ نقل کیا ہے صرف نمبر ڈال کر

پانچ حصوں پر تقسیم کر دیا ہے) واضح ہے۔

۱ؑ ممبران مدرسہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے مشورہ میں صداقت اور دیانت کے ساتھ (؟) مدرسہ کا لحاظ رکھیں۔ اپنی اغراض کی آمیزش قطعاً نہ ہو۔

۲ؑ مہتمم یا کوئی ایک شخص مختار مطلق نہیں ہو سکتا۔ اہل مشورہ سے مشورہ کرنا مہتمم کا فرض ہے۔

۳ؑ یہ ضروری نہیں کہ تمام ارکان شوریٰ جلسہ میں حاضر ہوں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ایک معتدبہ مقدار موجود ہو (یا اصطلاح حاضر کورم پورا ہو)

۴ؑ کورم پورا ہونے کے بعد جو رائے طے ہو۔ اس کی موافقت ہر ممبر پر لازم ہو گی۔ اب لیت و لعل ناجائز اور غلط ہے۔

۵ؑ سرپرست وغیرہ کے لئے ان تمام قواعد و ضوابط میں کوئی گنجائش نہیں صرف ایک مہتمم ہے جس کو اہل شوریٰ کے سامنے جواب دہ قرار دیا گیا ہے ہاں بظاہر نمبر (۴) اور نمبر (۵) میں تعارض ہے۔ کیونکہ نمبر (۴) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہتمم پر اگرچہ مشورہ لازم ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ اہل شوریٰ ہی ہوں بلکہ اگر کوئی وارد و صادر بھی ہو جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو تو اس سے بھی مہتمم مشورہ کر سکتا ہے۔ لیکن نمبر ۵ کا مفاد یہ ہے کہ اہل مشورہ کی معتدبہ مقدار سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ ورنہ مہتمم سے بازپرس کی جا سکتی ہے۔

لیکن نمبر ۵ کی روشنی ہی میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ نمبر ۴ کا تعلق اُن امور سے ہے جو مہتمم کے اختیارات میں داخل مانے جائیں۔ ورنہ پھر

ظاہر ہے کہ اہل مشورہ اور مجلس شوریٰ سب بیکار۔

مختصر یہ کہ ان دونوں نمبروں کا حاصل یہ ہوا کہ امور مشورہ طلب میں بہر حال۔ مشورہ فریضہ مہتمم ہے۔ پھر ایسے امور جو مہتمم کے اختیارات سے بالا ہیں ان میں ارکان شوریٰ سے مشورہ کرے اور جو امور اختیاراتِ مہتمم میں داخل ہوتے ہوئے مشورہ طلب ہوں ان میں اہل شوریٰ کی قید نہیں بلکہ کسی خیر اندیش مدارس اہل علم و عقل سے بھی مشورہ کر سکتا ہے۔

یہ ہے ارشاد ربانی وشاورھم فی الامر وامرھم شوریٰ بینھم کی اتباع کہ مہتمم کو ان امور میں بھی استصواب رائے کا حکم کیا گیا جو اس کے اختیارات میں داخل ہیں۔

بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ اصول مشاورت کو تسلیم کرتے ہوئے مہتمم یا صدر کا مختار مطلق ہونا گویا مجلس شوریٰ اور مشورہ کا استہزا اور تمسخر ہے البتہ مشورے کے سلسلہ میں ارکان شوریٰ کی رائے مختلف ہو تو معتد بہ مقدار کے پائے جانے پر غیر معتد بہ کا نظر انداز کیا جانا تو حضرت رح کی عبارت کے پانچویں فقرے سے ظاہر ہو گیا۔

لیکن سوال یہ رہا کہ اگر ایک جانب میں صرف ایک یا دو کی کمی ہو تو صورت فیصلہ کیا ہو گی۔ آیا صدر یا مہتمم کو حق ہو گا کہ اپنے اختیارات سے اقلیت کو راجح کر دے۔؟

حضرت بانی رح کے اصول پر بار بار غور کرنے کے باوجود اگرچہ مہتمم کے لئے کسی قسم کے خصوصی اختیارات سمجھ میں نہیں آتے بلکہ اس کے برعکس مہتمم کو

بظاہر مجلس شوریٰ اور اراکین کا بہت ہی زیادہ پابند کیا گیا ہے لیکن ایک دو کے تفاوت کی صورت میں کوئی راہ بھی ان اصول میں نہیں بتائی گئی۔ البتہ تعامل ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ اکثریت کا اعتبار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ فخر الہند مولٰنا حبیب الرحمن صاحب تعلیمات اسلام میں نہایت واضح اور مدلل طور پر اعتبار اکثریت پر بحث فرما کر آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس ہمارے بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ عقل کی رو سے درصورت اختلاف آرا اصل فیصلہ قوت دلیل پر ہو گا اگرچہ یہ قوت کسی ایک رائے کو مقابلہ بہت سی آرا کے حاصل ہو۔ لیکن درصورتیکہ قوت رائے معلوم کرنے کا کوئی معیار ہمارے پاس نہ ہو تو اس وقت قوت کی علامت کثرت رائے عقلا ہے اور کثرتِ رائے کے حق میں فیصلہ دینا حقیقتاً قوتِ دلیل ہی کی بنا پر ہو گا۔ اس کے علاوہ کثرت رائے کے حق میں فیصلہ دینے کی ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ جب آرا میں اختلاف ہے اور کوئی قوتِ جابرہ اس سے اوپر ایسی نہیں جو رائے مغلوب کو رائے غالب پر فوقیت دیدے تو اس اختلاف و نزاع کے مٹانے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔

ہر ذی رائے اپنی رائے پر مصر اُسی کو حق و صواب سمجھے ہوئے اسی کے موافق فیصلہ کا متمنی ہے

اِدھر قوت رائے کی کوئی محسوس چیز نہیں جس کے ماننے پر ہر کسی منکر کو مجبور کیا جا سکے۔

ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی راہ عمل نہیں کہ کثرت رائے پر

فیصلہ کیا جائے۔ کیونکہ کثرت ایک محسوس چیز ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ (تعلیمات اسلام ج ۱ ص ۹۶)

حضرت بانی کے اصول کی شرعی حیثیت

کاتب حروف اس وقت ان تمام مسائل پر تاریخی حیثیت سے بحث کر رہا ہے فقہی نقطۂ نظر سے ان اصول اور پھر تعامل کی حیثیت بتانی مقصود نہیں۔ شرعی حیثیت کے متعلق ایک شرعی فتویٰ اوائل اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اخبار الجمعیۃ کے متعدد نمبروں میں شائع ہو چکا ہے جس کو احقر نے علماء مراد آباد سے تبادلۂ خیالات اور کافی تحقیق و تنقیح کے بعد مرتب کیا تھا۔

تاہم اس قدر تنبیہ ضروری ہے کہ دار العلوم جیسے اداروں کا جب کوئی شخص بحیثیت ملک واقف نہیں تو بانی ہی کو واقف کی حیثیت دی جائیگی اور اس کے اصول و قواعد کا وہی احترام لازم ہو گا جو واقف کے شرائط وقف کا بالخصوص جب اس پر تعامل بھی رہا ہو۔

بانی کے بعد مہتمم کی حیثیت ناظر وقف کی ہے۔ اس کو بذاتِ خود کسی اصول کی تبدیلی کا کوئی حق نہیں۔ ہاں ممبرانِ ادارہ جو ارباب حل و عقد ہیں وہ بانی کے جانشین ہوں گے۔

لیکن اصول کی تبدیلی کا حق جانشینوں کو بھی نہ ہو گا۔ البتہ اصول کے تحفظ اور منشار اصول کے اجرار یا تکمیل کے لئے کچھ ضوابط معین کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایجنڈا یعنی جلسہ کی اطلاع کے لئے خاص مدت کا معین کرنا وغیرہ۔

لیکن مشورہ کے قواعد کو توڑنا۔ تمام کاروبار کو کسی ایک کے سپرد کر دینا۔

یا مہتمم کو بجائے ارکان شوریٰ کے کسی دوسرے شخص مثلاً صرف سرپرست کے سامنے جواب دہ قرار دینا۔ یا کسی کی شخصیت کو ارکین شوریٰ سے بالا ماننا۔ ظاہر ہے کہ وہ حضرت بانی قدس اللہ سرہ العزیز کے متعین کردہ اصول کی تنسیخ ہے جو کسی طرح جائز نہ ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خاندانِ ولی اللہؒ کے جانشین
مرکزِ علم کا انتقال

دیوبند اور بانیان دارالعلوم دیوبند

یہ قصبہ شہر سہارن پور سے جنوبی جانب ۲۲ میل کے فاصلہ پر اور دہلی سے شمالی مشرقی جانب تقریباً ۹۰ میل کے فاصلہ پر آباد ہے۔

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ یہ قصبہ کب سے آباد ہے۔ البتہ اس کی قدامت کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ سیدنا حضرت سلیمان ؑ کے زمانہ میں اس کا وجود تھا۔ ایک مقبرہ کے متعلق جو "شاہ جنگل بانس" کے نام سے مشہور ہے بتایا جاتا ہے کہ حضرت شیخ سعدیؒ کے معاصر اور علامہ ابن جوزی کے شاگرد کا مزار ہے، دیوبند کے بزرگوں سے یہ بھی سنا گیا کہ حضرت شیخ سعدیؒ سیاحت ہندوستان کے زمانہ میں شاہ صاحب موصوف سے ملاقات کے لئے دیوبند تشریف لائے تھے۔

اس مزار کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک پختہ تالاب ہے جس کو دیوی کنڈ کہا جاتا ہے۔ اور برہمنوں کی حکومت کے زمانہ کی یادگار بتایا جاتا ہے۔

اس کے گرداگرد بہت سے مندر ہیں۔ اس مقام کو متبرک مانا جاتا ہے
اور اس مقام پر ہندوؤں کا ایک میلہ بھی ہوا کرتا ہے۔

قصبہ کی آبادی تقریباً تیس ہزار ہے۔ جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔
ایک دراز عرصہ سے عثمانی اور صدیقی شیوخ کے دو خاندان آباد ہیں۔ دسویں صدی
ہجری کے آخر میں حضرت حاجی سید محمد ابراہیم صاحب لکھنؤ سے سفر کر کے بسلسلہ
سیاحت یہاں تشریف لائے۔ اور پھر یہ شاداب خطہ ایسا پسند آیا کہ یہیں قیام
پذیر ہو گئے۔ پہلی مرتبہ دیوبند کے ایک صدیقی گھرانے میں اور ان کی وفات پر
سادات بارہہ کے خاندان میں ایک خاتون سے نکاح کر لیا۔

اُن کی تشریف آوری سے دیوبند میں سادات کے خاندان کا بھی اضافہ
ہو گیا جو ہمیشہ باشندگان دیوبند کی نظر میں محترم رہا۔ ؎۱

شاہی زمانہ میں کچھ جاگیریں بھی اس خاندان کو عطا ہوئی تھیں مگر انقلاب
۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں وہ تمام ختم ہو گئیں۔

خصوصیات (۱) یہ امتیاز شاید دیوبند ہی کے لئے مخصوص ہے کہ اس کی ایک
تہائی سے زیادہ حصہ سادات اور شیوخ سے آباد ہے۔

(۲) بدقسمتی سے دارالعلوم دیوبند کی مخالف اور موافق دو جماعتیں تو قصبہ
میں موجود ہیں مگر عجب بات یہ ہے کہ عقائد سب کے ایک ہیں۔

(۳) قدیم زمانہ سے مسجدوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کل آبادی میں
ہزار ہے مسلمان تقریباً اٹھارہ ہزار مگر مسجدیں سو سے زیادہ ہیں۔

۱؎ مؤلف کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ محمد میاں عفی عنہ

(۴) ہندو اور مسلمانوں کے محلے الگ الگ ہیں - اور پھر اسٹیشن سے بازار میں گذرتی ہوئی ایک سڑک جامع مسجد تک پہنچتی ہے - اس سڑک کے ایک جانب خالص مسلمانوں کی آبادی ہے - دوسری جانب ہندوؤں کی - مسلم آبادی میں ہندوؤں کے مکانات دو چار سے زیادہ نہیں البتہ ہندو آبادی میں مسلمانوں کے کئی محلے آباد ہیں

(۵) سادات اور شیوخ قصبہ کے سر برآوردہ خاندان ہیں جو پہلے دولت کے لحاظ سے بھی فائق تھے - مگر اب ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے -

(۶) یہ خاندان اپنے نسب کی صحت پر کچھ ایسا نخوت آمیز اعتماد رکھتے ہیں کہ دیوبند کے سوا کسی دوسری جگہ شادی ان کے نزدیک عار ہے -

اس جاہلانہ جذبہ کا یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ ان تینوں خاندانوں کے افراد ایک دوسرے سے کوئی قرابت ضرور رکھتے ہیں مگر برا نتیجہ یہ ہے کہ ان خاندانوں کے تعلقات محدود ہو گئے ہیں اور ترقی اس سے بھی زیادہ محدود -

بانیان دار العلوم دیوبند (۱) حضرت حاجی حافظ سید عابد حسین صاحب قدس سرہ العزیز آپ کا تعلق خاندان سادات سے تھا - آپ صوفی منش، زاہد اور متقی بزرگ تھے -

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کا بیان ہے کہ ایک روز آپ کو بہت زیادہ رنجیدہ دیکھا گیا - کبیدگی اور افسردگی کی یہ حالت تھی کہ کسی نوجوان عزیز کی مرگ ناگہانی کا شبہ ہوتا تھا - سبب دریافت کیا گیا تو بہت زیادہ اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہو گئی -

(واقعہ یہ ہے ۲۸ سال پابندی میں خلل درحقیقت حادثہ عظیم ہے -)

آپ تقویٰ طہارت کے باوجود ایک بہت بڑے عامل بھی تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں۔

ہم شریک مشورہ اے نور عین	ہست حضرت حاجی عابد حسین
عامل کامل، ولی، مرد خدا	پائے او بر پائے فخر انبیا
ہم جمالی۔ ہم جلالی شانِ او	کانِ حلم و مخزنِ خلق نکو
نقش تعویذش مثالِ نقش قدر	فیض او بر خاص و عامی فضلِ بدر

دیوبند میں دینیات کی تعلیم کے لئے ایک مکتب کے قیام کا تخیل سب سے پہلے آپ ہی کے ذہن میں آیا۔

آپ نے دیوبند کے دوسرے بزرگ جناب مولانا مہتاب علی صاحب سے مشورہ کیا۔

(۲) مولانا مہتاب علی صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ العزیز کے عم اکبر (تایا) تھے۔

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد سیدنا شیخ الہند مولنا محمود الحسن صاحب) نے تحریر فرمایا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے مشورہ کرنے کے بعد ایک مکتب کے قیام کی تحریک کی۔

چندہ کے لئے جس نے سب سے پہلے رومال پھیلایا اور جس نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ حضرت حاجی عابد حسین صاحب ہی ہیں۔ ؎

؎ حضرت مولنا جمیل الدین صاحب قدس سرہ العزیز اور دیگر بزرگوں سے ایسا ہی سُنا ہے۔ ۱۱

اس مکتب یا مدرسہ کے قیام کے بعد مولانا محمود عرف ملّا محمود صاحب کو استاد کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔

یہ عجب اتفاق تھا کہ سب سے پہلے معلّم بھی محمود تھے اور سب سے پہلے طالب علم بھی محمود جو بعد میں ملّت ہندیہ کے لئے آفتاب ہدایت بن کر جلوہ فرما ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں مسلمانان ہند کی جانب سے متفقہ طور پر "شیخ الہند" کا عظیم الشان خطاب حاصل کیا۔

تیسرے بزرگ جن کو بانیان کے سلسلہ میں شمار کرنا چاہئے وہ جناب شیخ نہال احمد صاحب رئیس اعظم دیوبند تھے آپ کے مورث اعلیٰ شیخ لطف اللہ صاحب تھے جو سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دیوان تھے۔ آپ کا شاہانہ محل اس وقت محلہ دیوان کے نام مشہور ہے۔ جو دارالعلوم دیوبند کی عظیم الشان تعمیر سے متصل ہے۔

جس جگہ دارالعلوم کی قدیم تعمیر ہے وہ شیخ نہال احمد صاحب اور اُن کے اقارب ہی کی زمین تھی۔ آپ کی سخاوت کی مثالیں آج تک زبان زد ہیں۔

بہت مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اس طرف سے گزرنے والی بارات کو اپنے ہاں ٹھیرایا اور اس کی دعوت کی۔

جس وقت سیدنا حضرت سید احمد صاحب بریلوی قدس اللہ سرہ العزیز حج جاتے ہوئے اپنے قافلے کے ساتھ دیوبند پہنچے ہیں تو شیخ صاحب معروف نے کئی وقت تک میزبانی کی خدمت انجام دی تھی۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ العزیز سے شیخ صاحب کی ہمشیرہ منسوب تھیں۔ اور پھر شیخ صاحب موصوف بھی حجۃ الاسلام کے بہنوئی ہوئے

ثانی الذکر رشتہ کی صورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحؒ نے دیوبند میں عقد بیوگان کی تحریک کرتے ہوئے تقریر فرمائی تو مجمع میں سے ایک شخص نے حضرت موصوف پر یہ اعتراض کیا کہ آپ کی ہمشیرہ خود بیوہ موجود ہیں یہ محترمہ بیوہ ضرور تھیں مگر اس قدر سن رسیدہ کہ پلکیں بھی سفید ہو گئی تھیں مگر جذبۂ تبلیغ و اصلاح کا یہ صداقت و ولولہ یہ تھا کہ جلسہ گاہ سے فوراً ارکان تشریف لے گئے۔ ہمشیرہ محترمہ کے پاؤں میں دستار مبارک رکھ دی اور عرض کیا کہ ایک سنت کو زندہ کرنا آج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ احیاء سنت اور ترویج شریعت کے لحاظ میں ہمشیرہ بھی آمادہ نکاح ہو گئیں۔ آپ مجمع میں واپس تشریف لائے اور رحیم شیخ صاحب موصوف سے عقد کر دیا۔

احیاء سنت کی برکت تھی کہ اس قدر سن رسیدہ ہونے کے باوجود خداوند عالم نے اولاد عطا فرمائی۔

بانی اعظم بلاشبہ دیوبند میں پاک باطن بزرگوں کی ایک جماعت تھی جس نے ایک مکتب کی بنیاد ڈالی۔ مگر جس مقدس بزرگ نے معمولی مکتب کے بجائے دارالعلوم جیسی عظیم الشان انقلابی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ وہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رحؒ کی ذات گرامی تھی۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالعلوم کے پُرشوکت تصور سے حضرت حاجی صاحب کا ذہن خالی تھا۔ چنانچہ جب دارالعلوم کی تعمیر کا مسئلہ درپیش ہوا تو حاجی صاحب نے سختی سے مخالفت کی۔ حاجی صاحب کا اصرار یہی تھا کہ جامع مسجد کی سہ دریاں جو اسی خیال کے پیش نظر بنائی گئی تھیں کافی ہیں۔

مگر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رح کے سامنے دنیائے اسلام کے ایک مرکزِ علوم کا نقشہ تھا چنانچہ آج وہ سہ دریاں کسی ایک جماعت (کلاس) کے طلبا کے لئے بھی کافی نہیں ہو سکتیں، صرف پچاس ساٹھ طلبا ان سہ دریوں کے حجروں میں رہتے ہیں۔

اسی بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ دارالعلوم کی عظمت موجودہ کے مؤسس اور بانی صرف حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح ہیں۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب رح کا مولد و موطن قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور تھا۔ آپ طلب علم کے سلسلہ میں دہلی تشریف لے گئے اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو رفاقت حاصل ہو گئی ان دونوں بزرگوں کے ذہن و ذکاوت کے متعلق کچھ لکھنا آفتاب کی رونمائی ہے آج ہمارے پاس ان حضرات کی تصانیف موجود ہیں وہ بزرگوں کی عظمت جلالت کی نشاندہی کے لئے کافی ہیں۔

سلسلۂ تلمذ ان دونوں بزرگوں نے درس کی اکثر کتب درسیہ حضرت مولانا مملوک علی صاحب سے پڑھیں، جو اس مدرسہ کے مدرس تھے جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی جانب سے علوم عربیہ دینیہ کی تعلیم کے لئے اس واسطے قائم کیا گیا تھا کہ نیم غلام مسلمانوں کے سامنے علم دوستی اور مذہب پروری کا مظاہرہ کر کے ان کو پورا غلام بنا لیا جائے۔

مولانا مملوک علی صاحب کا وطن قصبہ نانوتہ تھا جو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کا وطن تھا۔ آپ حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب کے

شاگرد تھے اور حضرت مولانا رشید الدین خاں صاحب سیدنا حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز کے شہرۂ آفاق شاگرد تھے۔ جوہر فن میں یکتائے روزگار تھے اور خصوصاً رد شیعہ سے بہت زیادہ شغف تھا۔

حجۃ الاسلام اور امام ربانی کے دوسرے استاذ جناب مولانا مفتی صدرالدین صاحبؒ تھے یہ بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مشہور و معروف تلمیذ اور اس خاندان کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ سلسلہ حدیث میں آپ دونوں حضرت سیدنا شاہ عبدالغنی صاحبؒ[1] کے شاگرد تھے۔

بہرحال یہ دونوں بزرگ نیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (جو سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے مدرس اول ہوئے اور جو حضرت مولانا مملوک العلی صاحبؒ کے خلف رشید تھے) ایک یا دو واسطے سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔

دیوبند کی وجہ تخصیص قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ وجوہات کیا تھیں جن کی بنا پر دیوبند کو اس مرکز علوم کے لئے منتخب کیا گیا۔

دیوبند پیشتر سے علمی امتیازات کا مالک نہیں تھا۔ نہ سرزمین دیوبند کسی قسم کی کوئی مرکزیت رکھتی تھی اور عجب اتفاق یہ کہ وہ تینوں علماء جن کے فیوض و برکات کے لئے ارض دیوبند مطلع اور مشرق بنی دیوبند کے باشندے بھی نہ تھے۔

---

[1] حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب (تلمیذ خاص و جانشین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ) کے شاگرد تھے۔ قدس اللہ اسرارہم

ظاہری اسباب میں اس کا سبب وہی تعلق ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح کو جناب شیخ نہال احمد صاحب اور دو دیگر بزرگوں سے تھا۔

لیکن اس موقع پر چند دیگر واقعات کا نقل کرنا بھی یقیناً اہل ذوق کے لئے دلچسپی اور فروغ ایمانی کا ذریعہ ہوگا۔

(۱) قیام دار العلوم کے بعد اسی جماعت کے ایک بزرگ ؏ جب حج بیت اللہ کیلئے مکہ معظمہ میں حاضر ہوئے تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رح سے عرض کیا۔ ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کے لئے دعا فرمائیے۔

حضرت حاجی صاحب نے دلچسپ انداز میں فرمایا۔

سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقاء اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانقدر کو یہ سرزمین لے اُڑی۔

(۲) حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری اکابر اولیاء اللہ میں سے گذرے ہیں۔ آپ کا زہد و تقویٰ شہرۂ آفاق ہے

حضرت مولانا سید غالب علی صاحب مرادآبادی قاضی صاحب موصوف کے خلیفہ تھے مولانا غالب علی صاحب نے احقر سے فرمایا۔

"دار العلوم دیوبند۔ مدرسہ شاہی مرادآباد۔ مظاہر العلوم سہارنپور کو آپ آجکل کے مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں۔ حضرت پیر مرشد (مولانا قاضی محمد اسمٰعیل

؏ حضرت حاجی رفیع الدین صاحب

صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ مدارس خاص الہامات کے بموجب قائم کئے گئے ہیں۔

(۳) حضرت حاجی رفیع الدین صاحب قدس سرہ العزیز دار العلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے ہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک مدرسہ قائم فرمایا ہے۔ اس مدرسہ میں ایک طالب علم سے شاہ رفیع الدینؒ صاحب کی ملاقات ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد جب دار العلوم دیوبند قائم ہو چکا۔ اور حضرت حاجی رفیع الدینؒ صاحب مہتمم بنائے گئے تو آپ نے ایک روز ایک طالب علم کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ وہی طالب علم ہیں جن کو میں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مدرسہ میں دیکھا تھا۔

(۴) اس جگہ کوڑیاں پڑا کرتی تھیں۔ جہاں آج یہ مدینۃ العلم ہے۔

حضرت سید احمد صاحب شہید قدس اللہ سرہ العزیز اس طرف سے گذرے تو فرمایا "یہاں سے علم کی بو آتی ہے" اور اس کے قریب قیام فرمایا۔ اسی قسم کے اور بھی ایمان کو تازہ کرنے والے لطائف سُنے گئے ہیں۔ جن کو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" میں مدینۂ علم ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ ۱۲

قیام و تعمیر دارالعلوم دیوبند

تاریخ قیام[1]

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء یوم پنجشنبہ اسلامی ہند کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے جس میں ارض بطحا کا چشمۂ علم سرزمین ہند سے پھوٹا! رشد و ہدی کا ایک پودا سرزمین دیوبند میں لگایا گیا جو بہت جلد شجر طوبیٰ بنا اور اس کی شاداب شاخیں دنیائے اسلام کے علمی گلشنوں کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء تؤتی اکلہا کل حین ۰

تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ چندہ جمع کیا گیا۔ اور مسجد چھتہ[4] کے فرش پر درخت انار کی ٹہنیوں کے سایہ میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ چندہ کے لئے رومال پھیلانے والا اور سب سے پہلے چندہ دینے والا عابد[1] تھا۔ سب سے پہلا معلم محمود[2]۔ اور متعلم بھی محمود[3]

---

[1] اس باب کے تمام مباحث رسالہ القاسم کے دارالعلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ اور ارواح ثلاثہ سے ماخوذ ہیں۔

[1] حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب۔ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی وفات کے بعد ۱۲۹۶ھ میں جب تقسیم انعام کا جلسہ ہوا تو مولانا فضل الرحمن صاحب نے ایک فارسی نظم پڑھی تھی اس کا ایک شعر یہ تھا۔ مرد حق عابد صداقت کیش :: اولیں گسترا ندرو مالش اس کے بعد ایک مصرعہ یہ تھا چیزے از طیبات اموالش۔ باقی نظم یاد نہیں تھی [2] جناب مولانا محمود صاحب عرف ملا محمود ۱۲ [3] سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ۔ [4] دارالعلوم دیوبند سے متصل جانب جنوب میں ایک قدیم مسجد ہے جو مسجد چھتہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد بزرگان دیوبند کا اعتکاف گاہ بھی رہی ہے۔ ۱۲۔

۹ محرم الحرام کو ایک اشتہار کے ذریعہ سے قیام مدرسہ کا اعلان کیا گیا جس میں ظاہر کیا گیا کہ اس وقت تک چار سو ایک روپیہ آٹھ آنہ کا چندہ جمع ہو چکا ہے اور سولہ طالب علموں کی خوراک وغیرہ کا بندوبست کیا گیا ہے اور جیسے جیسے چندہ بڑھتا رہیگا طلبا کے لیے سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

اختتام سال تک طلبا کی تعداد اٹھتر ہو گئی۔ جن میں اٹھاون بیرونجات کے تھے ۵۲ طلبا کی خوراک کا ذمہ اہل شہر نے لیا۔ مدرسین میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ان کی تعداد پانچ تھی۔

سب سے پہلے مدرس دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود صاحب تھے جن کی تنخواہ ۱۵؎ روپیہ ماہانہ تھی۔

سب سے پہلے متعلم حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ العزیز

سب سے پہلے صدر مدرس طلبہ کے روز افزوں ہجوم نے بہترین مدرسین کے جمع کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو صدر مدرس کی حیثیت سے بلایا گیا جو اجمیر شریف یا کسی دوسرے مقام پر خدمت تدریس معقول مشاہرہ پر انجام دے رہے تھے۔ یہاں ان کا مشاہرہ ۴۰؎ ماہانہ طے کیا گیا۔

مولانا محمد یعقوب صاحب حضرت مولانا مملوک العلی صاحب (استاد حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب) کے صاحبزادے تھے۔ نقلی اور عقلی علوم کے ماہر تھے۔ اور ہر ایک فن سے کافی واقفیت رکھتے تھے۔ آپ کی جامعیت بے نظیر تھی۔ سنا گیا ہے کہ جو کتاب آپ کے سامنے آجاتی خواہ وہ کسی فن کی ہو اور خواہ اس کا مصنف کوئی ہو اس کو مطالعہ کے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔

یہ بھی سُنا گیا ہے کہ آپ مطالعہ کے وقت عموماً دونوں کہنیوں کو ٹیک کر بیٹھا کرتے تھے جس سے آپ کی کہنیوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ فرماتے ہیں۔

مولوی یعقوب صاحب اولیں — عالم جملہ فن دنیا و دیں
ہم بہ علم باطنی دارد کمال — ہست مقبول خدائے ذوالجلال
مرشد کامل ولی بے بدل — عابد و زاہد تقی بے خلل

سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی حافظ سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنائے گئے مگر آپ نے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہی زیارت بیت اللہ شریف کا عزم کر لیا۔ اہل شہر کو یہ بھی خطرہ تھا کہ شاید اب واپس نہ ہوں۔ چنانچہ آپ کی جگہ یکم شعبان ۱۲۸۴ھ کو حضرت حاجی مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کو مہتمم بنایا گیا۔

آپ اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند آپ کے خلیفہ تھے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ دور اہتمام سے پیشتر باہر جنگل میں رہا کرتے تھے۔ جب آپ کو مہتمم بنانے کا خیال ہوا تو کچھ آدمی آپ کو لینے کے لئے گئے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کو ایک رفیق کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت حجۃ الاسلام کا پیغام سُنکر آپ فوراً تشریف لے آئے۔

۱۲۸۶ھ میں حضرت حاجی رفیع الدین صاحب نے حج بیت اللہ شریف

۵۰۔ تحسین دارالعلوم دیوبند۔ دارالعلوم نمبر ص ۱۹

کا عزم فرمایا تو حضرت حاجی عابد حسین صاحب کو دوبارہ اہتمام سپرد کیا گیا۔

۱۲۸۸ھ میں جامع مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی جس کی نگرانی حضرت حاجی عابد حسین صاحب کے سپرد تھی۔ اور آپ کو اہتمام مدرسہ کی ذمہ داری کی فرصت کم ملتی تھی۔ لہٰذا حضرت حاجی صاحب کو کلی طور پر تعمیر جامع مسجد کا نگراں قرار دیتے ہوئے دوبارہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کو مہتمم بنا دیا گیا۔

سب سے پہلی مجلس شوریٰ حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی۔

حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ حضرت حاجی عابد حسین صاحب۔ مولانا مہتاب علی صاحب دیوبندی۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی (حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے والد ماجد) مولانا فضل الرحمٰن[۱] صاحب دیوبندی۔ شیخ نہال احمد صاحب دیوبندی۔ منشی فضل حق صاحب دیوبندی

سب سے پہلے دورۂ حدیث دار العلوم میں ۱۲۸۹ھ میں سب سے پہلے حدیث شریف کا دورہ ہوا۔

سب سے پہلے فارغ التحصیل ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۴ء کو سب سے پہلے مندرجہ ذیل پانچ حضرات نے دار العلوم دیوبند سے سند تکمیل اور دستار فضیلت حاصل کی۔

(۱) سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ مولانا عبد الحق صاحب ساکن پور قاضی۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی۔ مولانا فتح محمد

---

[۱] مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سابق مفتی اعظم دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی آپ ہی کے نامور صاحبزادگان ہیں۔

صاحب تھانوی ۔ مولانا عبداللہ صاحب جلال آبادی ۔

غیر معمولی شہرت دارالعلوم دیوبند کو ابتدا ہی سے عام مقبولیت اور غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی تھی ۔ چنانچہ آپ نے مطالعہ کیا کہ پہلے سال میں اٹھاون طلبہ بیرونجات کے اس مدرسہ میں داخل ہو چکے تھے ۔ اس سال طلبہ کی تعداد ایک سو تراسی تک پہنچ چکی تھی ۔

حسن انتظام خلوص اور للٰہیت کے ساتھ حسن انتظام ترقی کا پائیدار زینہ تھا چنانچہ ہر سال لازمی دستور تھا کہ امتحان سالانہ نہایت اہتمام اور انتظام کے ساتھ ہوتا امتحان کے لئے باہر سے حضرات بلائے جاتے اور معائنہ لکھتے تھے ۔ اسی طرح سالانہ حسابات کی جانچ ہوتی اور پھر عام جلسہ میں تمام سال کی روئیداد اور تمام طلبہ کے نمبر سنائے جاتے ۔ طلبہ کو حوصلہ افزا انعام دیئے جاتے ۔ وغیرہ وغیرہ

تلخ حقیقت یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل قصبہ نے مدرسہ، طلبہ اور کارکنان مدرسہ کے ساتھ انتہائی خلوص اور صداقت کا اظہار کیا ۔ اپنی حیثیت سے زائد مدرسہ کی امداد فرماتے رہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے اگرچہ نہایت تلخ ہے کہ اس سرچشمۂ رشد و ہدیٰ سے فیض حاصل کرنے میں کوتاہ رہے ۔

تقسیم انعامات و دستار فضیلت کے اسی جلسہ میں جو ۱۹ ر ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ کو ہوا تھا ۔ جس میں اطراف و جوانب کے علماء اور مشائخ کافی تعداد میں تشریف لائے تھے ۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک تقریر فرمائی تھی اسکے مندرجہ ذیل جملوں سے اہل شہر کی کوتاہی اور مدرسہ کی عالمگیر شہرت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

"دور دراز سے لوگ آئے اور اس دولت کو لوٹ لےگئے پر یہاں کے باشندے ویسے ہی خالی دامن پڑے رہے۔ ہائے افسوس اس مدرسہ کی خبر جس کے باعث دیوبند کا نام چار کھونٹ عالم میں پہنچ جائے دیوبند والوں کے کان میں نہ پہنچے چند ہند کے طالب علم جو شوق علم سے مکہ معظمہ میں پڑھتے تھے۔ دیوبند کے مدرسہ کا چرچا سنکر گرتے پڑتے مدرسہ دیوبند میں آپہنچے مگر کیا حسرت کی بات ہے کہ دیوبند والوں سے مدرسہ تک نہ پہنچا گیا۔ اطراف و جوانب کے لوگ شوق تماشا میں مدرسہ دیوبند کو آآکر دیکھیں۔ مگر دیوبند کے طالب علم کبھی بھولے بسرے بھی اُدھر کو نہ نکلیں"[1]

مکانات مدرسہ کی تبدیلی اور تحریک تعمیر چھتہ کی مسجد میں مدرسہ ابتداءً میں رہا اُس کے بعد قاضی کی مسجد میں اور کرایہ کے مکانات میں رہا لیکن طلبہ کی کثرت ہوئی تو کارکنان مدرسہ رحمہم اللہ اس طرف متوجہ ہوئے کہ مدرسہ کے لئے ایک مستقل مکان بنایا جائے۔ ابتداءً بعض بزرگان مدرسہ نے احاطہ جامع مسجد میں مدرسہ کے حوائج ضروریہ کو پورا کرنے والی عمارت کی فکر کی اور جامع مسجد کی تینوں سمتوں میں متعدد حجرے اور کمرے بنوا دیئے۔ چنانچہ چند سال تک مدرسہ جامع مسجد ہی میں رہا۔ لیکن پھر آخری رائے یہی ہوئی کہ مدرسہ فراخ جگہ میں شہر کے کنارے پر ہونا چاہئے تاکہ بوقت ضرورت اس میں اضافہ بھی کیا جاسکے نیز مدرسہ اور مسجد کا باہمی مناقشہ بھی نہ ہو۔

---

[1] دارالعلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ ص ۶۵

تعمیر جدید کی منظوری کے بعد چار پانچ روز شہر کے مختلف گوشوں کے دیکھنے کے لئے گشت کیا گیا۔ بالآخر حضرت حجۃ الاسلام کی تحریک پر یہی جگہ پسند کیگئی جہاں اس وقت مدرسہ واقع ہے۔

۱۲۹۱ھ کے جلسہ تقسیم انعام منعقدہ مورخہ ۱۹ ذی قعدہ میں تعمیر مدرسہ کے متعلق حاضرین کو توجہ دلائی گئی چنانچہ ایک معقول رقم نقد موصول ہوئی اور ایک طویل فہرست وعدہ کنندگان کی مرتب ہوئی۔

ابتداء تعمیر ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ یوم جمعہ کو نماز کے بعد جامع مسجد میں شہری اور بیرونی حضرات کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ جس کی اطلاع اشتہار کے ذریعہ پیشتر سے دیجا چکی تھی۔ اور جس میں شرکت کے لئے مرادآباد اور علی گڈھ وغیرہ کے آدمی آئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے تقریر فرمائی۔ اور آخر میں اعلان فرمایا کہ سب حضرات تشریف لے چلیں تاکہ مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھدیا جائے۔

حضرت حاجی عابد حسین صاحب چونکہ جامع مسجد کی سہ دریوں کو مدرسہ کیلئے کافی سمجھتے تھے انہوں نے اس وقت بھی مخالفت کی۔ چنانچہ جب مجمع مدرسہ کی بنیاد گاہ پر جارہا تھا حضرت حاجی صاحب الگ ہوکر مسجد چھتہ میں تشریف لے آئے۔

لیکن حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو اپنے ایک رفیق کی ناگواری اور کبیدگی کب گوارا ہوسکتی تھی۔ آپ بھی پیچھے پیچھے مسجد چھتہ میں پہنچ گئے اور حاجی صاحب سے پکار کر فرمایا۔ اجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور ہم سب آپ کے چھوٹے ہیں آپ نے ان چھوٹوں کے ساتھ کیا بے رخی اور بے توجہی برتنی شروع فرمادی۔ کچھ ان الفاظ کا ایسا اثر حاجی صاحب پر ہوا کہ بے اختیار ہوکر گر پڑے۔ اور اتنے روئے

کہ آواز نکل پڑی اور کہا کہ مولانا اللہ میرا قصور معاف فرمایئے حضرت نے حاجی صاحب کو اٹھا کر گلے لگالیا اور فرمایا کہ حاجی صاحب آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ تو ہمارے بڑے ہیں، بزرگ ہیں۔ پھر حضرت حاجی صاحب کو لیکر بنیاد پر پہنچے جو کھُد کر تیار تھی۔ دراس وقت کے اکابر کا خیال تھا کہ کوئی مقدس اور بزرگ ہستی ایسی نہ تھی۔ جو اس موقع پر موجود نہ ہو۔

اب یہ گفتگو ہوئی کہ پہلی اینٹ کون رکھے۔ حضرت حجۃ الاسلام اگرچہ اس تمام سلسلہ کے لئے روح رواں تھے مگر آپ ظاہری امتیاز کے موقع پر ہمیشہ پیچھے رہتے حتیٰ کہ مدرسہ کی زمین کا بیع نامہ بھی حاجی صاحب کے نام کرایا۔

بہرحال اس موقع پر حجۃ الاسلام نے تجویز فرمایا کہ سب سے پہلے حضرت میاں جی[1] منّے شاہ صاحب خشت بنیاد رکھیں کیونکہ وہ بزرگ بھی ہیں پھر حضرت حاجی حافظ عابد حسین صاحب اینٹ رکھیں۔ ان کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے اینٹ رکھوائی۔ پھر سب کے ساتھ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اینٹیں رکھیں۔

اس دن اہل اللہ کے قلوب پر ایک عجیب سرور تھا۔ ایک عجیب خوشی تھی اور سب کے دل فرحت سے مالا مال تھے۔[2]

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس مبارک بنیاد کو قندیل معلق سے

---

[1] آپ کی صداقت و سادگی زہد و تقویٰ کی مثالیں آج تک دیوبند میں زبان زد ہیں۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند قدس سرہ العزیز آپ کے نواسے تھے ۱۲

[2] ارواح ثلاثہ

تشبیہ دی جو توکل اور اعتماد علی اللہ کی سنہری زنجیر میں آویزاں ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اسی مضمون کو مندرجہ ذیل اشعار میں نظم فرمایا ہے۔ ؎

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اسکے لئے — کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ — یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اسکی تو بس اسکا معین — آہ اگر جائیگا پیدا دوسرا ہو جائیگا

تاریخ تعمیر مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں "مولانا و استاذنا مولوی محمد یعقوب صاحب "تاریخ تعمیر" اشرف عمارات یافتہ اند" [۱]

ارکان شوریٰ سنہ ۱۲۹۱ھ میں حسب ذیل حضرات ارکانِ شوریٰ تھے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ۔ حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ۔ مولانا ذو الفقار علی صاحبؒ۔ منشی فضل حق صاحب دیوبندیؒ۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ [۲]

طبقات اکابر دار العلوم دیوبند

پہلا طبقہ۔ از سنہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء تا محرم سنہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء قیام دار العلوم دیوبند
دوسرا طبقہ۔ از سنہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء تا سنہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۴ء
تیسرا طبقہ۔ از سنہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۴ء تا سنہ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء

---

۱ ارمغان مدرسہ بحوالہ دار العلوم نمبر ص۳۳ ۱۲ ۔ ۲ دار العلوم نمبر ص۱۹ ۱۲

چوتھا طبقہ موجودہ۔

پہلے طبقے کے اکابر | سیدنا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی مہاجر مدنی قدس اللہ سرہ العزیز۔ شیخ العرب والعجم سیدنا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز

دوسرے طبقہ کے اکابر | حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت حافظ حاجی سید عابد حسین صاحب۔ حضرت حاجی رفیع الدین صاحب۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز) حضرت مولانا مہتاب علی صاحب (برادر بزرگ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب) وغیرہ وغیرہ۔

اُن دونوں طبقات کے اکابر کے حالات بقدر ضرورت تحریر کئے جا چکے صرف حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے مختصر حالات آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

تیسرے طبقہ کے اکابر

از ۱۲۹۷ھ تا ۱۳۳۰ھ

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز

شیخ الہند امام حریت حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز۔

حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی قدس اللہ سرہٗ العزیز

حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب رائے پوری

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز

حضرت موصوف کے مفصل حالات تذکرۃ الرشید میں ملاحظہ فرمائے جائیں

آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کے رفیق اور مخلص دوست تھے۔ گویا دو قالب تھے جن میں ایک روح کارفرما تھی۔ زمانہ طالب علمی سے ساتھ ہوا، جو آخر تک رہا حجۃ الاسلام کی وفات تک آپ کا سیاسی ماحول ایک ہی ہے اور خدمات میں مقابلہ کرنا احقر جیسے کوتاہ فہم کے لئے گستاخی ہے۔

زہد و تقویٰ اور روحانی کمالات میں مراتب اور تفاوت وہ بیان کرے جو خود اُن اوصاف کا ماہر ہو۔ خاکسار جیسا شخص تو دونوں حضرات کی گرانقدر تصانیف کو دیکھ کر یہی کہہ سکتا ہے کہ حجۃ الاسلام علم کلام کے امام ہیں جنھوں نے جدید دلائل اور جدید اصول پر جدید کلام مرتب کیا اور حضرت امام ربانی فقہ اور حدیث کے ایک جلیل الشان مبصر اور فقید المثال ماہر ہیں جنہوں نے مسائل فقہیہ کو احادیث پر منطبق کر کے درس حدیث کا ایسا طرز قائم فرمایا جو یقیناً بے نظیر اور بہت زیادہ ضروری تھا۔

حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری فرمایا کرتے تھے "امام ربانی نہ صرف مذہب ابو حنیفہ کے ماہر تھے بلکہ چاروں مذاہب کے فقیہ تھے۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو چاروں مذہبوں کا ماہر ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ یہ دونوں بزرگ ۱۸۵۷ء میں حضرت حاجی امداد اللہ کے وزیر اور تحریک کے روح رواں تھے۔

انتظام تحریک پر امام ربانی گرفتار کئے گئے۔ مگر درحقیقت یہ قدرت کا کرشمہ تھا کہ اس تمام سرگرمی کے باوجود خداوند عالم نے نجات دلادی۔ ابھی مقدمہ پیش ہی تھا کہ عام معافی کا اعلان ہو گیا۔ تاہم چھ ماہ تک حوالات یا جیل خانہ میں رہنا پڑا

جب دار العلوم دیوبند کی تحریک شروع ہوئی تو آپ اس کے سربرآوردہ رکن تھے۔ حضرت حجۃ الاسلام کے مشیر خاص تھے۔

۱۲۹۶ھ میں حجۃ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کی وفات ہوئی تو امام ربانی نے فرمایا۔ سالار قافلہ چل بسا جو کسی وقت خود بھی شہید ہوتا اور ہمیں بھی قربان کراتا

حجۃ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ دار العلوم دیوبند کے بانیٔ اعظم تھے مگر آپ نے صدارت یا اہتمام کبھی منظور نہیں فرمایا۔

وفات کے بعد حضرت حاجی رفیع الدین صاحب اہتمام پر اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہ العزیز صدارت پر بدستور فائض رہے۔

البتہ حجۃ الاسلام کی جگہ حضرت گنگوہیؒ کو سرپرست کا درجہ دیا گیا لیکن یہ کوئی آئینی یا با اختیار منصب نہیں تھا بلکہ تمام کارکنان مدرسہ کے عقیدتمندانہ تعلق نے حضرت گنگوہی کو سرپرست بنادیا تھا۔

بایں ہمہ اختلاف رائے کا حق تھا اور ایسے موقعوں پر مجلس شوریٰ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا تھا۔

حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی ثم الدھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے

اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے دو مثالیں پیش کیں تھیں۔

(۱) حضرت گنگوہی[۵] کی رائے نہ تھی کہ دار العلوم میں فلسفہ اور منطق کا درس ہو

ایک مرتبہ تعمیل ارشاد کے لئے یہ دونوں فن خارج کر دیئے گئے لیکن پھر ارکانِ

شوریٰ نے کچھ عرصہ بعد ان دونوں فنوں کو داخل نصاب کر لیا۔

شوریٰ کی اس تجویز کو نہ حضرت گنگوہی کے احترام کے مخالف سمجھا گیا نہ

حضرت گنگوہی کو کوئی کبیدگی ہوئی۔

(۲) حضرت مولانا محمد حسن صاحب (برادر خورد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن

صاحب قدس اللہ سرہ العزیز) کو ارکین شوریٰ نے مدرسہ کا طبیب مقرر کیا۔ حالانکہ

حضرت گنگوہیؒ اس کے مخالف تھے۔

اس سرپرستی کا عملی پہلو یہ تھا کہ حضرتِ موصوف موقع بموقع دیوبند تشریف

لاکر بچشم خود حالات مدرسہ کا معائنہ فرماتے۔

سرپرستی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ گنگوہ میں درس حدیث کا سلسلہ جاری تھا۔

دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد شائقین حدیث گنگوہ حاضر ہوتے اور

برکات سے مستفیض ہوتے۔

وفات سے چند سال پیشتر تک درس حدیث کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

تاریخ وفات | ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء روز جمعہ۔

---

[۵] حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی ثم امداد دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز سابق رکن دار العلوم دیوبند نے فرمایا کہ حضرت گنگوہیؒ نے خواب دیکھا کہ دار العلوم دیوبند کی اس عمارت میں جسکو نودرہ کہتے ہیں ایک اجتماع ہو رہا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں۔ فخر موجودات کی نظر ایک کتے پر پڑی جو نودرہ کے سامنے صحن میں بیٹھا ہوا ہے حکم ہوا اس کتے کو نکال دیا جائے۔ حضرت گنگوہی نے منطق اور فلسفے کو کتے کی تعبیر تصور کی واللہ اعلم۔

سیاسی ماحول

کانگریس کی ابتدا انسان فطرۃً آزاد پیدا ہوا ہے وہ اپنے ماں باپ کا بھی غلام نہیں ہوتا تو دوسرے کی غلامی کب گوارہ کرسکتا ہے۔

اس کی فطرت ترقی پذیر ہے۔ دنیا کا یہ پُر رونق اور شاندار تمدن اسکی ترقی پذیر فطرت کا اندوختہ ہے۔ اسی ارتقا پسند فطرت نے اس کو عزت و اقتدار کا تاج پہنایا اور دنیا کی ہر چیز کو مسخر کر دیا۔

انسان کو اگر غلام بنا سکتا ہے تو صرف احسان الانسان عبد الاحسان لیکن ہندوستان تقریباً ایک صدی بیشتر سے آزادی کی دولت سے محروم ہو چکا تھا اور ایک ایسی قوم کے زیر اقتدار آچکا تھا جو احسان کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی اغراض پر ہندوستانی دولت و راحت کو قربان کرنے کے لئے ہندوستان پر قابض ہو رہی تھی۔

مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہندوستان کے کروڑ ہا باشندے اپنی فطرت کو فراموش کر بیٹھیں چنانچہ بلا امتیاز مذہب و ملت ایک متحدہ کوشش کی گئی جو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے مشہور ہوئی۔ حریت اور آزادی کے اس مقدس جہاد میں علماء ملت کا کتنا حصہ تھا اور پھر اس کا کیا حشر ہوا۔ یہ آپ شاندار ماضی جلد دوم کے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

بہر حال وہ دور ختم ہوا۔ ہندوستانیوں کو خوب خوب کچلا گیا۔ مگر کیا ان کے جذبات بھی ختم کر دیئے گئے۔ جبل گردد۔ جبلّی نہ گردد۔

چنانچہ ۱۸۵۷ء سے صرف پانچ سال بعد ۱۸۶۲ء میں خاندان ولی اللہی کے جانشینوں یعنی سید صاحب کے خلفانے آزاد سرحد پر باقاعدہ جنگ شروع کردی۔ جس کے مقابلے کے لئے لارڈ الگن وائسرائے ہند کو پوری جد وجہد کرنی پڑی اور پھر اس جہاد کی امدادی صورتوں کو ہندوستان سے روکنے کے لئے ۱۸۶۴ء میں انبالہ کا مقدمہ ہوا[1]۔ اس کے بعد تحریک دار العلوم دیو بند کا آغاز ہوا جو مسلمانان ہند میں جذبات حریت باقی رکھنے کے لئے ایک کامیاب تحریک تھی۔

حکومت ہند ان تمام جذبات سے غافل نہیں تھی۔ اُس کی خفیہ پولیس اُن جذبات کی اطلاع بھی یقیناً دیتی رہی ہوگی جو سب سے پہلے علاقہ بمبئی کے مرہٹوں میں نمودار ہو رہے تھے اور رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے بموجب ان کا آرگن مسٹر بال گنگا دھر تلک "لوکمان تلک" کا اخبار کیسری تھا۔[2]

جس کے نتیجہ کے طور پر ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو پلیگ کمشنر "مسٹر رانڈ" اس کے رفیق "لفٹنٹ ایرسٹ" ایرسٹ کو بمبئی میں قتل کیا گیا۔[3]

لیکن انقلابی تحریکات کے لئے ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو نہتا کر کے زنانہ بنا دیا گیا تھا۔ بندوق اور رائفل تو درکنار تلوار اور برچھی بلم وغیرہ کی بھی اجازت نہیں رہی تھی۔ دوسری جانب یورپ میں روزانہ نئے نئے آلاتِ حرب ایجاد ہو رہے تھے اور ہندوستانیوں کی حالت یہ ہوتی

---

۱ ملاحظہ ہو شاندار ماضی (جدید) جلد دوم ۱۲ مطبوعہ کاشی رام پریس ۱۲

۲ رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ ص ۱۱ ۳ ایضاً ص ۱۳

جاری تھی کہ بندوق اور رائفل کی آواز سے بھی اُن کے حواس خطا ہونے لگے تھے

کانگریس کی بنیاد بہرحال گورنمنٹ آف انڈیا اور اس کی سرپرست طور معظم پارلیمنٹ کے لئے ضروری تھا کہ جذبات حریت کو فرو کرنے کے لئے کوئی صورت تجویز کرے۔ تشدد مفید نہیں تھا لہٰذا طے یہ کیا گیا کہ جذبات کا رُخ پھیر دیا جائے مندرجہ ذیل تحریر سے اس تمام بیان پر روشنی پڑتی ہے [1]

لارڈ رپن کے زمانہ میں البرٹ بل کو ناکام بنانے میں اینگلو انڈین اصحاب نے جو منظم کوشش کی تھی اسے ہندوستانیوں نے بہت محسوس کیا۔ مختلف صوبوں میں چند سیاسی جماعتیں موجود تھیں ۱۸۷۶ء میں بنگال میں انڈین ایسوسی ایشن بن چکی تھی اور ۱۸۸۴ء میں مدراس میں مہاجن سبھا قائم ہو چکی تھی البرٹ بل کی ناکامی سے ان جماعتوں میں حرکت پیدا ہوئی اور ہر طرف سیاسی چرچا ہونے لگا جس سے انگریز بہی خواہان ہند کو اندیشہ ہوا کہ یہ بڑھتی ہوئی بے چینی نہ معلوم کیا شکل اختیار کرے گی۔

اس لئے مسٹر اے۔ او۔ ہیوم پنشنر سویلین ہندوستان کی سیاسی رہنمائی کے لئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے سب سے اول ہندوستانی گریجویٹوں کو ایک چٹھی اس مضمون کی لکھی کہ اگر آپ لوگ ذاتی آسائش اور ذاتی مفاد کو ٹھکرا کر اپنے ملک کے لئے زیادہ آزادی اور ایک بہتر اور غیر جانبدارانہ آئین حاصل نہ کر سکیں جس میں آپ لوگوں کا ہاتھ ہو تو آپ کے مخالفین صحیح ثابت ہوں گے اور ہم جو آپ کے دوست ہیں غلط ثابت ہونگے اور

---

[1] اس بل کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ ہی انگریزوں کے مقدمات بھی طے کیا کریں۔ (روشن مستقبل)

لارڈ رپن کے اعلیٰ منصوبے جو آپ کی بھلائی کے لئے تھے بے نتیجہ اور محض خیالی رہ جائیں گے اور ترقی کے تمام خیالات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

آپ کو چاہئے کہ انگریزوں کی شکایت کرنا چھوڑ دیں کہ تمام بڑے عہدوں کے دینے میں انہیں ترجیح دی جاتی ہے اور یہ کہ ہندوستانی غلامی کے رسّوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے اگر آپ لوگ جدوجہد نہیں کرتے تو اسی برتاؤ کے مستحق ہیں کہ آپ کو اس حالت میں رکھا جائے۔ کیونکہ آپ لوگوں میں ملکی ہمدردی اور بے نفسی کی وہ صفات نہیں ہیں جو انگریزوں میں ہیں جن کی وجہ سے انہیں ترجیح دیجاتی ہے۔ ان حالات میں اُنھیں آپ کا حاکم بنا رہنا چاہئے اور آپ کے کندھوں کو اپنے جوؤں سے خوب زخمی کر دینا چاہئے جس سے کہ آپ اس بات کو سمجھ جائیں کہ ذاتی قربانی اور بے نفسی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کے ذریعے آزادی اور خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ [۱]

اس کے بعد مسٹر ہیوم اس زمانہ کی تمام سیاسی جماعتوں سے خط و کتابت کرتے رہے حتیٰ کہ دسمبر ۱۸۸۴ء میں تھیوسافیکل سوسائٹی پونا کے جلسہ میں طے ہوا کہ آئندہ سال کے دسمبر میں کانگریس کا پہلا جلسہ طلب کیا جائے۔

جلسہ کے ابتدائی امور طے کر کے مسٹر ہیوم۔ لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے پاس چند تجاویز لیکر گئے جن کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے لئے وہ اصلاح رسوم اور اصلاح تمدن کی انجمن قائم کریں۔ مگر لارڈ ڈفرن نے انھیں حسب ذیل الفاظ

---

[۱] اہل ہند کا قومی ارتقا از اے۔ سی مزمدار صفحہ ۴۲ بحوالہ روشن مستقبل ۱۲

میں یہ مشورہ دیا۔

اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو مثل انگلستان کے بطور ملک منظم کی مخالف جماعت کے کام کرتی ہو۔ چونکہ انگریزوں کو یہ علم نہیں کہ ہندوستان میں ان کی نسبت اور ان کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں حاکم اور محکوم دونوں کے لئے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست داں اصحاب سالانہ جمع ہوکر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اس کا انتظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کی حالت کس طرح بہتر کی جا سکتی ہے۔ [1]

یہ مشورہ دیتے وقت "لارڈ ڈفرن" نے مسٹر ہیوم سے کہدیا تھا کہ جب تک وہ وائسرائے ہیں ان کے اس مشورہ کا اظہار نہ کیا جائے۔ چنانچہ ان کے چلے جانے کے بعد یہ واقعہ روشنی میں آیا۔

لارڈ ڈفرن سے معاملہ طے کرنے کے بعد مسٹر ہیوم انگلستان گئے اور وہاں پارلیمنٹ کے ممبروں سے گفتگو کی۔ اور بہت سے لبرل اصحاب سے ہمدردی اور امداد کے وعدے لئے اور ہندوستان واپس آکر جملہ صوبوں سے جدا جدا ڈیلیگیٹ طلب کر کے کانگریس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا۔ اس طرح جو لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے وہ مختلف صوبوں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے۔ اسی لئے مسٹر ہیوم نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ یہ مجلس آئندہ زمانہ میں ہندوستان کی پارلیمنٹ ہوگی۔

سب سے پہلی تجاویز | کانگریس کے سب سے پہلے اجلاس میں مندرجہ ذیل

[1] اہل ہند کا قومی ارتقا بحوالہ روشن مستقبل صہ ۳۵۲

تجاویز پاس کی گئیں۔

(۱) ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق و متحد کر کے ایک قوم بنانا۔

(۲) اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو، اس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(۳) ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کیلئے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طرح ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا

اُس وقت کانگریس کا تعلق حکومت سے اس قدر قریب تھا کہ مسٹر ہیوم نے وائسرائے سے یہ سفارش کی تھی کہ کوئی گورنر کانگریس کی صدارت کرے مگر وائسرائے نے کہا کہ گورنر کی موجودگی میں لوگ آزادی سے اظہار رائے نہ کر سکیں گے

سید طفیل احمد صاحب مصنف روشن مستقبل کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں انگریزوں کی ایک جماعت موجود تھی جو دل سے ہندوستان کی ہمدرد اور اسکی ترقی کی خواہاں تھی۔ مسٹر ہیوم اور لارڈ ڈفرن کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ یہ جماعت زیادہ دنوں نہ رہ سکی اور ہندوستان کی سیاست پر ایسے انگریزوں کا غلبہ ہوگیا جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا ہندوستان کی بہبودی کو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارہ نہ کرتے تھے۔

بہرحال سب کچھ بھی ہوا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اجلاس کانگریس کی پہلی تجاویز ہی کچھ انگریزوں کی مرضی کے خلاف واقع ہوئیں ان میں مسٹر بیک کا ذکر خیر

زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو علی گڈھ کالج کے پرنسپل اور سر سید کے مزاج پر حاوی تھے۔
(تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو روشن مستقبل)

اس کے بعد اگرچہ پچیس برس تک کانگریس پر رجعت پسندوں کا قبضہ رہا اور ہندوستان کے جاہ طلب اور انگریز پرست افراد ہی عموماً کانگریس پر چھائے رہے مگر کانگریس کی تجویز ۱ و ۲ بنیادی طور پر انگریز کو ناگوار تھی کیونکہ برطانوی سامراج اور انگریزی شاہنشاہیت کی "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی اساسی پالیسی کے منافی تھی۔ چنانچہ شاہنشاہیت پرست انگریزوں نے کانگریس کی مخالفت کو اپنا فرض تصور کیا۔ مختلف صورتوں سے کانگریس کی مخالفت شروع کردی اور انتہائی افسوس ہے اس مکروہ حقیقت کی نقاب کشائی کرنی پڑتی ہے کہ ہندو مسلم تفرقہ اندازی کے لئے علی گڈھ کالج کو کام میں لایا گیا (تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ناظرین روشن مستقبل میں ملاحظہ فرمائیں)

مختصر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق ہی وہ نقطہ تھا جس پر کانگریس اور انگریز کا مقابلہ شروع ہوگیا۔

کانگریس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

اور انگریزی حکومت کا بنیادی نقطہ نظر یہ تھا کہ

ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات سے واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی نظم و نسق سے یہ اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے

کہ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو۔ [1]

متحدہ قومیت کا مسئلہ آج بھی ہندو مسلمانوں کے نزدیک نہایت اجنبی اور وحشت ناک چیز ہے اور پھر اس مسئلہ کو سر سید صاحب نے خوب خوب اچھال کر مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب جدوجہد کی۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ظاہر کر دیا جائے کہ اس سے پیشتر کہ سر سید صاحب کے خیالات پر مسٹر بیک کا قبضہ ہو خود سر سید صاحب کے خیالات کیا تھے۔

سر سید نے فرمایا تھا۔

قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔

یاد رکھو! ہندو مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں جب سب ایک گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے ۔۔۔۔

اب وہ زمانہ نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں۔ [2]

دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا

جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں اسی طرح مسلمان

---

[1] حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۲ [2] مجموعہ لیکچر سر سید صفحہ ۱۶۷ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۶ ۱۲

بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاتے ہیں۔ [۱]

سفر پنجاب میں ہندوؤں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

آپ نے جو لفظ ہندو کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں کیونکہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں بلکہ ہر شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں اپنے تئیں ہندو نہیں سمجھتے [۲]

تحریک کانگریس اور حضرت امام ربانی

عُلمائے ملّت کے رُجحانات

کانگریس قائم ہوئی۔ اس کا نظریہ واضح ہوا۔ انگریزوں کی جانب سے اسکی مخالفت شروع ہوئی۔ سر سید صاحب انگریزی پالیسی کا آلہ کار بنے۔ مسلمانوں میں کانگریس کے برخلاف ہیجان پیدا کیا گیا۔ ہندو سے نفرت دلائی گئی۔ انگریز کی وفاداری کا درس دیا گیا۔ اس کے وجود کو سایۂ رحمت تصور کرنے کی فرمائش کی گئی۔ یہ تھا حضرت امام ربانی کا سیاسی ماحول۔

اس زمانہ کی سیاست کے پیش نظر مندرجہ ذیل سوالات تنقیح طلب ہیں۔ ان کے جوابات سے حضرت امام ربانی کے سیاسی مسلک کی توضیح ہو جائے گی

---

[۱] سر سید کے آخری مضامین صفحہ ۱۲۱ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲ ۱۲ [۲] سفر نامہ پنجاب سر سید صفحہ ۵ ۱۲ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۸ ۱۲

(۱) ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام ؟

(۲) کیا انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جدوجہد ضروری ہے ؟

(۳) آزادیٔ وطن کی کیا صورت ہو ؟

(۴) جانشینان ولی اللہ نے آزادی کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا ؟

(۵) کیا وطنی مطالبات اور ملکی مفاد کے لئے ہندوؤں کے ساتھ کانگریس میں شرکت جائز ہے ؟

(۶) یہ حضرات کانگریس کے ممبر کیوں نہیں رہے ؟

ہندوستان کی حیثیت

نمبر ۱ کا جواب سو سال کامل گذر گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صاف اور صریح الفاظ میں دے چکے جہاد کا لائحہ عمل بنا چکے۔

تحریک حضرت سید صاحب کا تمام ہنگامہ برپا ہوا۔

ملتِ اسلامیہ کے ہزاروں عزیز نوجوان شہید ہوئے۔ سیکڑوں خاندانوں کے چراغ گُل ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کا خونی معرکہ ہندوستان کے چپہ چپہ کو خون شہداء سے رنگین کر چکا ہزاروں نوجوان توپوں کے لقمے بنا دیئے گئے۔ لاکھوں درخت وحشتناک پھانسیوں کا نظارہ دیکھ چکے۔

یہ سب کچھ ہو چکا مگر انگریزی فتنہ اور یوروپین دجل و فریب کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق اب بھی شبہ تھا۔

چنانچہ مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا املی اللہ صاحب کشمیری نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے استفسار کیا۔ جس کے جواب میں حضرت امام ربانی نے نہایت مبسوط اور مدلل فتوی فارسی زبان میں تحریر فرمایا۔ جس کی اشاعت کانگریسی وزارتوں سے پہلے ناممکن رہی اور جیسے ہی (۱۹۳۷ء میں) کانگریس وزارت قائم ہوئی تو بازار کی چلتی والی چیز تصور کرکے اس کو ایسے بزرگ نے شائع فرمایا جن کا مسلک اس فتوے کے خلاف ہے اور پھر آخر میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے سابق پرنسپل نے ایک صفحہ کا بے معنی فتوے لگا کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا۔

امام ربانیؒ سات صفحہ کی مفصل اور مدلل تحریر کے بعد بطور نتیجہ فرماتے ہیں۔

اکنوں حال ہند را خود غور فرمائند کہ اجرائے احکام کفار نصاریٰ دریں جا بچہ قوت و غلبہ ہست۔ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کرد کہ در مساجد جماعت ادا مکنید، ہیچ کس از امیر و غریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید۔

اب ہندوستان کی حالت پر آپ خود غور فرمائیے کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجرا کس قوت اور غلبہ کے ساتھ ہے اگر ایک ادنیٰ کلکٹر حکم کردے کہ مسجدوں میں جماعت نہ ادا کریں تو کسی بھی امیر یا غریب کی مجال نہیں رہتی کہ مسجد میں جماعت ادا کرسکے۔

چند سطور کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

بہر حال تسلط کفار بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار بادار حرب زیادہ ازیں نبود۔ و ادائے مراسم

بہر حال کفار کا تسلط ہندوستان پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا کسی دار الحرب پر اس سے زیادہ غلبہ نہیں ہوتا۔ اور جو اسلامی

اسلام از مسلمانان محض باجازت ایشان است واز مسلمان عاجز ترین رعایا کسے نیست ہنود را ہم رسوخ ست مسلمانان را نیست۔	رسومات اور شعائر مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں وہ صرف ان کی اجازت سے۔ کوئی رعایا مسلمانوں سے زیادہ عاجز نہیں ہنود کو بھی کسی قدر رسوخ حاصل ہے۔ مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔

جواب نمبر ۲ ہندوستان جبکہ مسلمانوں کا ملک تھا انگریزوں نے اس کو غصب کیا اور دار الحرب بنایا تو انگریزوں کو نکالنا لامحالہ فرض ہوا۔ جواب نمبر ا کے بعد اس پر بحث کی حاجت نہیں رہتی

جواب نمبر ۳ یعنی آزادئ وطن یا انگریزوں کے اخراج کی کیا صورت ہو بیشک یہ مسئلہ قابل غور تھا اور زمانہ کی رفتار نے اس کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔

صورت یہ ہے کہ جب تک ظاہری اسباب کی بنا پر اس درجہ قوت نہ ہو کہ فتح کی امید کی جا سکے۔ شرعی حیثیت سے اقدام کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اٹھارویں صدی کے آغاز تک سرفروشوں کی کثرت سامانِ فتح ہوا کرتی تھی لیکن اب توپوں، رائفلوں وغیرہ جدید آلات حرب نے نوجوانوں اور سرفروشوں کے بجائے آلات حرب اور فراہمی سرمایہ پر فتح و شکست کو منحصر کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستانیوں سے آلات حرب چھین کر ان کو فن سپہ گری سے قطعاً نابلد کر دیا گیا تھا۔

جواب نمبر ۴ لیکن ان تمام مایوس کن حالات کے ہوتے ہوئے ان حضرات نے ہمت نہ ہاری۔ ایک دوسرا نقشہ جنگ تیار کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تنظیم کرتے ہوئے دیگر ممالک سے امداد حاصل کی جائے اور ہندوستان

کو آزاد کرایا جائے۔ اس کا مفصل ذکر سیدنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے تذکرہ میں آئے گا (انشاء اللہ)

جواب نمبر ۵ پانچواں نمبر یہ کہ وطنی مطالبات اور ملکی ضروریات کیلئے کانگریس میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں -

یہ وہ مسئلہ ہے جو ۱۸۸۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۳ء تک طے نہیں ہو سکا اور جب تک انگریزی شہنشاہیت ہندوستان پر مسلط ہے ممکن نہیں کہ اس قسم کے مسئلے طے ہو سکیں -

اس میں شک نہیں کہ کچھ علماء دیانتداری کے ساتھ عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں مگر اصولی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یعنی دار الحرب کو دار الاسلام پر قیاس کیا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس حیات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی فرماتی ہے -

ہجرت کے بعد تک مکہ معظمہ دار الحرب رہا - آپ کی مقدس زندگی کا بیشتر حصہ اسی دار الحرب میں گذرا - ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے وقت سیرت مقدسہ کا یہی حصہ ہمارے سامنے رہنا چاہیئے -

سیرت مقدسہ کی مبسوط اور مستند کتابوں پر عمیق نظر رکھنے والے حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ قریش کی اندرونی رقابت نے کس طرح ظہور اسلام کے وقت قریش کو دو گروہ میں منقسم کر دیا تھا جن میں سے ایک گروہ جس کے لیڈر ابو طالب تھے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا - حالانکہ اس کے بہت سے افراد آخر تک مسلمان نہیں ہوئے -

کیا یہ غلط ہے کہ انگریز کے مقابلہ پر مسلمانان ہند کا ہندوؤں سے تعلق وہی نوعیت رکھتا ہے جو مسلمانان مکہ کا قریش کے اس گروہ کے ساتھ تھا۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کی پناہ میں نہیں تھے۔ کیا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابن دغنہ کی پناہ نہیں لی اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کی وفات کے بعد مطعم بن عدی کی پناہ میں نہیں آئے۔ کیا اس عرصہ کے لئے قرآن پاک کے یہ احکام نہ تھے۔

(الف) اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۔ تم اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے نازل کی جا رہی ہے اسکے سوا تمہا کوئی معبود نہیں اور مشرکین سے اعراض کرتے رہو

(ب) اعراض کی تفسیر دوسری آیت میں وارد ہوئی۔

دَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ان کی ایذا رسانی سے قطع نظر کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو

كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز کی پابندی کرو

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔

اور کیا یہ غلط ہے کہ دار الحرب کیلئے یہ تعلیمات آج تک بدستور قائم ہیں۔ منسوخ نہیں ہوئیں تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو (حجۃ اللہ البالغہ) باب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تفسیر اتقان۔ سیرت ابن ہشام۔ طبقات ابن سعد وغیرہ۔ مزید توضیحات کے لئے ملاحظہ ہو۔ رسالہ[۱] جواز شرکت کانگریس وازالہ شکوک

بہر حال دلائل کچھ بھی ہوں، ہمیں اس وقت امام ربانی رح کا فتوی پیش کرنا ہے دلائل پر بحث کرنا موضوع کلام سے خارج ہے۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ام

---

[۱] یہ رسالہ ۱۰ کے ٹکٹ بھیجکر دفتر مرکزیہ جمعیۃ علماء ہند سے طلب کیجئے۔

زمانہ کے حالات پر روشنی ڈالنے کے لئے استفسار کے الفاظ بھی نقل کر دیئے جاتے ہیں۔

تقریباً ۱۸۸۹ء میں یعنی انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے کچھ دنوں بعد علمارِ ہند کے سامنے مندرجہ ذیل سوالات پیش کئے گئے۔

(۱) ہنود کے ساتھ معاملات دنیوی میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں۔

(۲) ایک جماعت قومی مسمی بہ نیشنل کانگریس جو ہندو مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کی واسطے رفع تکالیف و جلب منافع دنیوی چند سال سے قائم ہوئی ہے اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انہی امور پر ہو جو کل جماعتہائے ہند پر مؤثر ہوں اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کے لئے مضر ہوں۔ یا خلاف شرع ہوں تو ایسی جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں [۵]

(۳) سید احمد خاں نیچری نے جو ایک جماعت (الیسوسی ایشن) قائم کی ہے اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۸ اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس کے برخلاف ہیں شامل ہیں۔ ہر شخص جو داخل ہو پانچ پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علیگڈھ یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے وغیرہ وغیرہ اور اس کی مدد کے واسطے جابجا الیسوسی ایشن انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں جو شخص ان کے ساتھ اتفاق کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح

---

[۱] ملاحظہ ہو رسالہ نصرۃ الابرار صفحہ ۱۳ مطبوعہ مطبع صحافی لاہور ایجنس گنج۔ یہ رسالہ اس استفتاء اور اس کے جوابات کا مجموعہ ہے جو اسی زمانہ میں طبع ہوا تھا۔ ۱۲

[۵] معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلم لیگ کا موروثی مرض اور اس کی جدی خصلت ہے ۱۲

کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اسکو بڑھانا چاہتے ہیں یا ایسی جماعت میں مسلمانوں کو شامل ہونا اور انکی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں۔ اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں۔

حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ العزیز تینوں سوالوں کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع و شراء و تجارت میں کر لیویں اس طرح کہ اس میں کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے، جائز ہے اور مباح ہے۔ مگر سید احمد صاحب سے تعلق نہ رکھنا چاہئے اگرچہ وہ خیر خواہی ذمی کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو۔ مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام اور مسلمانوں کیلئے سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا۔ پس اس کے شریک مت ہونا۔ اور ہنود سے شرکت معاملہ کر لینا۔ اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو یا مسلمانوں کی ذلت یا اہانت اور ہنود کی ترقی ہوتی ہو۔ وہ کام بھی حرام ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ اسی طرح یہ ہے اور بس۔ ص۱۹ نصرۃ الابرار ۲۶ محرم ۱۳۰۶ھ

جواب نمبر ۶ | یہ حضرات کانگریس کے ممبر کیوں نہیں رہے۔

اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حضرت امام ربانی اور اسی طرح دیگر حضرات انتہا پسند تھے۔ ان کا مطمح نظر کامل حریت تھا۔ اگرچہ ملک اور قوم کے عام مفاد کے لئے آئینی جد و جہد کو بھی پسند فرماتے ہوئے شرکت کانگریس کے جواز کا فتوی دیتے رہے۔ مگر چونکہ کانگریس کا نصب العین اس وقت صرف یہ تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت ہو۔ اس لئے اپنے واسطے شرکت کانگریس کو

منظور نہیں فرمایا اور حریت کاملہ کے لئے وہ راہ عمل اختیار کی جس کا تذکرہ آئندہ آئے گا (انشاء اللہ)

حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متعلق سلسلۂ کلام کو ختم کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند امور کی وضاحت کر دی جائے۔ جو حضرت موصوف کے مذکورہ بالا فتوے کے لئے پس منظر یا نتائج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱) ۱۸۵۷ء میں جس طرح حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اپنے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی زیر قیادت۔ جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا اسی طرح لدھیانہ کے اس خاندان نے بھی اس جہاد میں بہت کافی حصہ لیا تھا جسکے ایک رکن مولانا عبد العزیز صاحب نقشبندی مجددی تھے اور آج مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اور مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی اسی حریت پسند خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو مولانا موصوف نے اسکی حمایت کی۔ سرسید گروپ نے ان کے برخلاف ایک طوفان اٹھادیا اور ایک فرضی استفتاء مرتب کر کے علماء سے اس کا جواب حاصل کیا۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے اس پر دستخط کرائے گئے اور پھر یہ فتویٰ مولانا عبد العزیز صاحب پر چسپاں کر کے پروپیگنڈا کیا گیا کہ مولانا عبد العزیز صاحب ہندوؤں سے مل گئے ایمان فروش ہیں۔ فاسق ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مولانا عبد العزیز صاحب نے یہ تماشا دیکھا تو حیران رہ گئے۔ حضرت مولانا گنگوہی رح کو حقیقت حال سے مطلع کیا اور پھر خود ایک سوال مرتب کیا۔ واقعہ کے انکشاف کے

بعد حضرت گنگوہی اور تمام حضرات نے (جن کے اسمار گرامی مولانا عبدالعزیز صاحب کے برخلاف قابل ملامت اور نفرت انگیز طریقہ سے استعمال کئے گئے تھے) معذرت کی۔ چنانچہ حضرت گنگوہی رح کے الفاظ معذرت یہ ہیں ۔

حامداً و مصلیاً۔ بندہ رشید احمد گنگوہی عرض کرتا ہے کہ لدھیانہ سے ایک استفتار اس مضمون کا آیا کہ جو شخص ہنود کی اعانت اور مسلمانوں کو ضرر دیوے وہ کیسا ہے۔ بندہ نے جواب لکھا تھا کہ وہ "فاسق" ہے یہ خلاصہ سوال وجواب کا ہے اب وہ فتویٰ بندہ کا طبع ہوا۔ اور اس کے اول تین صفحے لکھے دیکھے جس سے معلوم ہوا کہ وہ سوال مولوی عبدالعزیز صاحب لدھیانوی کی نسبت ہے اور وہ وجوہ اعانت راضرار اس مصرح لکھے۔ لہذا بندہ راست راست کہہ کر مسلمانوں کو مطلع کرتا ہے اور اپنا ذمہ بری کرتا ہے کہ مولوی عبدالعزیز صاحب ہرگز ہرگز مصداق اس فتوے کے نہیں ہیں اور جو امور ان کی طرف اس تحریر میں منسوب ہیں ان کی وجہ سے بندہ ہرگز انکو محل اس جواب فتوے کا نہیں جانتا۔ اگر سائل اس تفصیل کو درج سوال کرتا تو بندہ ہرگز یہ جواب نہ لکھتا۔ جو کچھ اس تحریر میں درج ہے اس کی تاویل صحیح ہے۔ اگر واقعی ان سے یہ امور ایسے ہی سرزد ہوئے ہیں اور اس عبارت میں جو گستاخ کلام نسبت مولوی صاحب کے ہے وہ سخت نازیبا ہے بندہ کے نزدیک علمار کی شان میں ایسا کلام موجب ہتک اسلام رسم ہے پس جو صاحب اس بندہ کو صادق جانتے ہیں اور جو بندہ کی تحریر کی وجہ سے مولوی عبدالعزیز صاحب سے بدعقیدہ ہوئے ہیں میں ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ہرگز مصداق اس فتوے بندے کے نہیں ان سے معذرت کرنا اور معافی چاہنا اور اتحاد سخت

کرنا لازم ہے واللہ ولی التوفیق۔ کتبہ الراجی رحمۃ اللہ رشید احمد گنگوہی عفی اللہ تعالیٰ عنہ[۱]

جب یہ حقیقت منقح ہوگئی تو اس کے بعد شرکت کانگریس اور شرکت ایسوسی ایشن کے متعلق مندرجہ بالا سوالات علمائے کرام کے سامنے پیش کئے گئے۔

(۱) مولانا عبدالعزیز صاحب کے مندرجہ بالا واقعہ اور سوال دوم کے الفاظ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کانگریس کے حامی علماء کے برخلاف جو شرمناک پروپیگنڈا آج کیا جارہا ہے وہ اسی زمانہ کی پیداوار ہے۔ کانگریس پر اسلام کشی کی فرد جرم اسی وقت سے لگادی گئی ہے اور کانگریسی علماء کے لئے اسلام فروش۔ غدار ملت۔ ہندوؤں کے غلام۔ فاسق۔ کافر وغیرہ وغیرہ اسی وقت تصنیف ہوچکے تھے۔ آج جو کچھ کیا جارہا ہے وہ اسی آموختہ کو دہرایا جارہا ہے۔

(۲) انڈین نیشنل کانگریس کے لفظی معنی ہیں ہندوستانی قومیت (نیشن) رکھنے والوں کی جماعت۔

اس کے اغراض ومقاصد پہلے ہی اجلاس میں یہ قرار دیئے گئے۔

(۱) ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے اُن سب کو متحد ومتفق کرکے ایک قوم بنانا۔

(۲) اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو۔ اس کی دماغی۔ اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(۳) ایسے حالات کی اصلاح وترمیم کرانا جو ہندوستان کے لئے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طرح ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد ویگانگت کو استوار کرنا۔

---

[۱] نصرۃ الابرار شائع کردہ حافظ مشتاق احمد صاحب لدھیانوی ۱۸۸۸ء صفحہ ۵

(۴) "رفع التکالیف اور جلب منافع کے دنیاوی امور" کو جو انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر طے پاتے ہیں جن کا تعلق بحیثیت ہندوستانی ہونے کے تمام باشندگان ملک سے یکساں ہوتا ہے ان کو حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز بیع وشرا اور خرید وفروخت کے معاملات کی حیثیت دے رہے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان امور کی یہ حیثیت نہ ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ میونسپل بورڈ سے لیکر اسمبلیوں کالجوں اور ایوان تجارت تک کسی بھی ہندوستانی ادارہ یا سرکاری محکمہ میں شرکت کو جائز کہا جائے۔ تمام سرکاری۔ نیم سرکاری اور غیر سرکاری، تجارتی، معاشی، قانونی اور تعلیمی اداروں میں شرکت جائز اور شرکت کانگریس حرام۔ یہ سیاسی بدعت نہیں تو اور کیا ہے

(۵) کسی بات کا سرکار کے مخالف نہ ہونا بھی جواز شرکت پر اثر انداز نہیں کیا کوئی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ انگریز بہادر کی سرکردگی میں تو ہندو مسلم اشتراک جائز ہو۔ اور اگر یہ منحوس سایہ ہٹ جائے تو وہ جائز چیز ناجائز ہو جائے۔ اگر معاذ اللہ ایسا ہے تو قرآن وحدیث مرجع شریعت نہ رہا بلکہ انگریزی ہیٹ۔ معاذ اللہ شریعت کا گنبد بن گیا

(۶) فتویٰ ظاہر کرتا ہے کہ ایسے مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعلق انتہا درجہ خطرناک ہے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض اور اپنے ذاتی خیالات کو کامیاب بنائیں۔

ہندو بیشک کافر ہے۔ اس کے پاس کفر وشرک موجود ہے مگر وہ نمایاں زہر ہے جس سے ہر انسان بچ سکتا ہے لیکن اس نام نہاد قائد اسلام کے پاس میٹھا زہر ہے۔ جس کو تمیز کرنا مشکل اور نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔

وہ بعض بزرگ، جو آج مسٹر جناح کی قیادت عظمیٰ پر مطمئن ہیں۔ قادیانیوں

کے ساتھ اشتراک عمل اور تعلق کو حرام کہا کرتے تھے اور یہی نکتہ بیان فرمایا کرتے تھے
(۸) فتوے سے موجودہ مسلم لیگ کی شرکت کا حکم بھی واضح ہو جاتا ہے۔
کیونکہ سرسید تاہم مذہبی شخص تھے۔ نماز روزہ کے بھی غالباً پابند تھے۔ شراب وغیرہ سے قطعاً مجتنب تھے اگرچہ قرآن حکیم کی آیتوں کی تاویل و تفسیر اپنی رائے کے مطابق کرتے تھے۔ نبوت و رسالت۔ معجزہ۔ وحی وغیرہ کے متعلق اپنے مخصوص خیالات کے حامی تھے مگر تاہم قرآن حکیم کے احکام کو جنجال نہ کہتے تھے۔
دوسروں کو بیشک یوربین وضع قطع کی ترغیب دیتے تھے مگر خود اپنی پرانی وضع قطع پر آخر تک قائم رہے۔
لیکن موجودہ مسلم لیگ اور اس کے قائدان تمام خطرات میں سرسید اور ان کے ایسوسی ایشن سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ نماز روزہ کی پابندی تو درکنار۔ نماز روزہ سے صحیح واقفیت بھی نہیں۔ ان کے نزدیک قرآن پاک کے احکام معاذ اللہ ترقیات زمانہ سے پس ماندہ اور جنجال ہیں (دیکھو تقریر مسٹر جناح مسلق سوں میرزح بل ۱۹۱۲ء)
یوربین ڈانس۔ کاک ٹیل وغیرہ محبوب مشاغل۔ وضع قطع ٹھیٹ یوربین علماء کے اقتدار ختم کرنے کا عزم مصمم مسلم رافضیوں اور قادیانیوں کا معجون مرکب۔
یہ تمام واقعات اظہر من الشمس ہیں جو ان سے چشم پوشی کرے یا ان پر پردہ ڈالے اس سے بڑھ کر مداہن فی الدین کون ہو سکتا ہے
(۹) انڈین نیشنل کانگریس میں جواز شرکت کے حکم سے نیشن اور قومیت کے بارے میں بھی حضرت گنگوہی کے خیال کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ الواقعہ مدار

قومیت مذہب ہوتا اور متحدہ قومیت ناجائز ہوتی تو حضرت گنگوہی جیسے دقیقہ رس فقیہہ کیلئے قطعاً ناممکن تھا کہ وہ مشترک جماعت کیلئے نیشنل کانگریس - قومی جماعت کا لفظ برداشت کرتے اور پہلے ہی دہلہ میں اس پر تنقید نہ کرتے ۔ بالخصوص جبکہ سوال کا پہلا لفظ ہی یہ ہے "ایک جماعت قومی" اور جبکہ کانگریس کا پہلا مقصد ہی یہ ہو کہ ہندستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق و متحد کرکے ایک قوم بنانا "السکوت فی معرض البیان" بیان کیا ایسے ہی موقع کیلئے نہیں ہے اور کیا اس اصول کے بموجب متحدہ قومیت کے متعلق حضرت گنگوہیؒ کا نظریہ واضح نہیں ہو جاتا ۔

سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

تیسرے طبقہ کے دوسرے بزرگ سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہیں ۔ آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے سب سے زیادہ برگزیدہ اور محبوب روحانی فرزند تھے ۔

پیدائش اور تعلیم آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ؎ میں ہوئی ۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی تھے جو دارالعلوم دیوبند کی سب سے

؎ آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ میں بمقام بریلی ہوئی جبکہ آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب بسلسلۂ ملازمت مع اہل و عیال وہاں مقیم تھے ۔ تذکرۃ الخلیل ص ۱۱۱ ۱۲

پہلی مجلس شوریٰ کے ایک مقتدر رکن تھے۔

ابتدا ہی سے آپ کو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے سپرد کر دیا گیا تھا یعنی کامل آفتاب کی خدمت میں ایسا باکمال آئینہ پیش کر دیا گیا تھا جس نے نہ صرف نورِ آفتاب کو سمیٹا بلکہ اسکی تمام حرارتوں کو بھی اپنے اندر سمو لیا آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہی وہ آئینہ ہے جسکے تلمذ سے دار العلوم دیوبند کا افتتاح ہوا۔ یہی وہ محمود ہیں جن کے استاذ بھی محمود تھے اور جن کی وجہ سے مدرسہ بھی محمود ہوا۔ اس باکمال آئینہ نے اولاً حجۃ الاسلام کے منبع فیوض سے سینہ کو معمور کیا اور پھر دربار رشیدی کا بہترین ہیرا بن کر جملہ خصوصیات کا حامل بنا اور اس طرح قاسمی اور رشیدی آفتابوں کا ماہِ کامل بنکر عالم میں چمکا۔

تکمیل و تدریس | سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں آپ تحصیل علوم سے فارغ ہوئے

عہ مولانا عاشق الٰہی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ۱۲۸۴ھ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ العزیز نے کنز الدقائق، میبذی اور مختصر معانی کا امتحان دیا۔ ۱۲۸۵ھ میں ہدایہ مشکوٰۃ اور مقامات حریری کے امتحان میں شریک ہونے پر ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں جو اس وقت میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع کی خدمت تصحیح قبول فرمائے ہوئے تھے۔ آخر فارغ ہو کر ۱۲۸۸ھ میں اسی مدرسہ کے معین المدرسین بنے۔ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ کو آپ کی دستار بندی ہوئی اور ۱۲۹۲ھ میں آپ مدرس چہارم قرار دیئے گئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی وفات پر مولانا سید احمد صاحب دہلوی للعہ مشاہرہ پر مدرس اول قرار دیئے گئے اور ملا محمود صاحب صہ پر مدرس دوم اور مولانا محمود الحسن صاحب بمشاہرہ ۳۰ء مدرس سوم اور آپ کی جگہ مولانا عبد العلی صاحب مدرس چہارم بنائے گئے۔ دو ہی سال گذرے تھے کہ ملا محمود صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا

(باقی صفحہ ۱۰۹ پر)

طلب علم کے زمانہ میں بھی سلسلہ تدریس جاری تھا اور اب پورے طور سے آپ تدریس میں مشغول ہو گئے۔

سنہ ۱۲۹۱ھ میں حسب تجویز مجلس شوریٰ معین المدرسین بلا تنخواہ کے مقرر ہوئے اور سنہ ۱۲۹۲ھ میں باضابطہ بمشاہرہ مبلغ صعہ مدرس چہارم ہوئے۔ [1]

منصب صدارت پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ العزیز تھے۔ سنہ ۱۳۰۲ھ [ع] میں آپ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی صدر مدرس بنائے گئے۔ [2]

آپ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۵ھ میں دار العلوم کے مدرس سوم مقرر کئے گئے تھے۔ ہیئت اور علم ریاضی میں آپ اجتہادی شان رکھتے تھے [3] سنہ ۱۳۰۵ھ تک آپ صدر مدرس رہے۔ پھر حجاز مقدس تشریف لے گئے۔ سنہ ۱۳۰۵ھ میں سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کو قبار صدارت پہنا دیا گیا۔ جس کو قسام ازل کے دست انتخاب نے آپ کے اندازِ قامت پر قطع کیا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۱۰۸) اور اس انقلاب میں حضرت مولانا مدرس دوم بنا دیئے گئے مگر اسباق آپ کے متعلق صحاح ستہ اور بڑی کتابوں کے رہے سنہ ۱۳۰۵ھ میں مولانا سید احمد صاحب بھوپال تشریف لیگئے تو باتفاق آرا آپ کو اسی للعہ مشاہرہ پر مسند صدارت پر بٹھا دیا گیا اور مولانا عبد العلی صاحب مدرس دوم بنا دیئے گئے۔ تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۱

ع بغرض ہیضہ اپنے وطن نانوتہ ضلع سہارنپور میں درجہ شہادت حاصل کیا (تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۱

[1] دار العلوم صفحہ ۶۹ [2] دار العلوم صفحہ ۴۳ [3] ایضاً۔ صفحہ ۴۴

آپ نے ۱۳۳۳ھ تک دارالعلوم میں علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔
چونکہ آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے تلمیذ خاص اور ہمراز رفیق تھے۔ لہٰذا آپ تحریک دارالعلوم دیوبند کے اصلی منشا سے بخوبی واقف تھے۔
چنانچہ آپ کی تدریس، خشک اور جامد زہد و تقویٰ کی تلقین نہیں کرتی تھی بلکہ آپ کی تربیت نے ایسے حضرات کو پیدا کیا جو آج آسمان سیاست کے روشن ستارے مانے جاتے ہیں۔
مندرجہ ذیل حضرات شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ کے ممتاز تلامذہ ہیں۔ ہندوستان کا ہر ایک مسلمان ان سے واقف ہے۔
یہ حضرات شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی اعلیٰ تربیت کا نمونہ ہیں۔ ان حضرات کی سیرت و سوانح تحریک دارالعلوم کے اصل منشا کو طشت از بام کرتی ہے۔

سیدنا شیخ الہند حضرت مولٰنا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ممتاز تلامذہ

(۱) شیخ الاسلام سیدی و مرشدی حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی۔ (۲) علامہ جلیل بطل حریت حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی۔

(۳) علامۂ جلیل امام العصر حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز۔

(۴) ابوحنیفۂ وقت حضرت علامہ مولانا محمد مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند۔

(۵) مجاہد جلیل۔ مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری قدس سرہ

(۶) فخر الہند حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ العزیز سابق مہتمم دار العلوم دیوبند۔

(۷) مولانا سید احمد صاحب مہاجر مدنی وبانی مدرسۃ الشرعیۃ مدینہ طیبہ نور اللہ مرقدہٗ

(۸) حضرت مولانا محمد صدیق صاحب مہاجر مدنی

(۹) حضرت علامۃ الاستاذ مولانا محمد اعزاز علی صاحب مفتی اعظم دار العلوم دیوبند

(۱۰) حضرت علامہ مولانا سید فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

(۱۱) حضرت علامۃ الشیخ مولانا عبد السمیع صاحب استاذ دار العلوم دیوبند قدس اللہ سرہٗ العزیز۔

(۱۲) مفسر قرآن حضرت علامہ مولانا احمد علی صاحب مہتمم انجمن خدام الدین شیرانوالہ لاہور

(۱۳) حضرت مولانا محمد صادق صاحب کراچی

(۱۴) حضرت مولانا عزیر گل صاحب رفیق اسارت مالٹا۔

(۱۵) مولانا عبد الوہاب صاحب دربھنگہ۔

(۱۶) مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی۔

(۱۷) مولانا عبد الرحیم صاحب پوپلزی وغیرہ وغیرہ

تصنیف وتالیف | سلسلہ درس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ حاشیہ ابوداؤد شریف۔ حاشیہ مختصر المعانی۔ ایضاح الادلہ ابواب وتراجم بخاری شریف۔ جہد المقل وغیرہ وغیرہ آپ کی اعلیٰ ذکاوت کا نمونہ ہیں اور اس

سلسلہ کی آخری کڑی بھی قرآن پاک کا وہ الہامی ترجمہ ہے جس کو باتفاق علماء ہند بے نظیر اور سب سے زیادہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔[1]

سیاسی ماحول اور خدمات

۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۸ء میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی وفات ہوئی اس سے سات سال بعد کانگریس برطانیہ کی ایک وفادار جماعت کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ عام ہندوستانیوں کی جس بے چینی اور بے کلی نے انگریز مدبرین کو کانگریس کے قیام پر مجبور کیا تھا۔ جب اس کا تذکرہ کیا جائے تو یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ خاندان ولی اللہی کے ان جانشینوں کے دل بھی اسی سوز و اضطراب کے شمعدان تھے۔ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علماء ملت کے مخلصانہ قلوب پروپیگنڈہ سے عموماً متنفر رہے اسی لئے اس زمانہ کی جدوجہد منظر عام پر نہ آسکی اور آج بھی ہم اس کے متعلق مطبوعہ کتابوں کا حوالہ نہیں پیش کر سکتے۔

ثمرۃ التربیت کا قیام | مگر باخبر حضرات واقف ہیں کہ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے احباب نے فضلاء اور بہی خواہان تحریک دار العلوم دیوبند کی ایک جماعت بنائی تھی۔ جس کا نام تھا "ثمرۃ التربیت"۔ یعنی تعلیم و تربیت کا پھل۔ ایک عرصہ تک اس جماعت نے کام کیا۔ مگر پھر وہ بظاہر سست پڑ گئی اور ۱۲۹۵ھ سے تیس سال بعد ایک دوسرے نام سے اس کا ظہور ہوا جس کا تذکرہ چند سطور بعد ملاحظہ

---

[1] مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ بجنور نے اس کو چند بار طبع کرایا۔ یہ ترجمہ اور اس کا حاشیہ دیگر تمام اردو کی تفاسیر سے مستغنی اور بے نیاز کر دیتا ہے۔ ۱۲

گذرے گا

ملکی حالات جن جذبات کی پیش بندی کے لیئے کانگریس کا قیام ہوا تھا۔ اُن کی بندش نہ ہو سکی۔ بلکہ کانگریس خود ان جذبات سے متاثر ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ انگریز کے مقابلہ کے لئے سینہ تاننا شروع کر دیا اور پھر قیام کانگریس سے سات آٹھ سال بعد وہ جذبات عمل میں آنے لگے جن کے خطرات سے بچنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس انگریزوں کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی۔

صوبہ وار حالات مختصر طور پر درج ذیل ہیں

صوبہ بمبئی ۱۸۹۷ء کو بمبئی میں مسٹر راند اور لفٹنٹ ایرسیٹ قتل کر دیئے گئے یہ قتل مرہٹوں کی بیداری کا نتیجہ تھا "بال گنگا دھر تلک" کا اخبار "کیسری" مرہٹوں کا ترجمان اور تحریک کا رہنما تھا۔ اس نے اس قتل کی بھی کچھ حمایت کی۔ چنانچہ مسٹر تلک پر مقدمہ چلا اور اُن کو سزا ہو گئی مگر گورنمنٹ کے مُخالف اخبارات کی طرز تحریر میں کچھ فرق نہ واقع ہوا۔[1]

بنگال میں نریندر ناتھ دت بی۔اے جو بعد میں سوامی ویکانند کے نام سے مشہور ہوئے تھے ۱۸۹۷ء میں میدان میں آئے اور حریت واستقلال کی طرف اپنی قوم کو دعوت دینی شروع کر دی ان کا انتقال ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ اور بریندر[2] گھوش اور اس کا بھائی اربندا گھوش ۱۹۰۲ء میں اس تحریک کے قائد بن گئے۔

---

[1] باغیانہ تحریک کے متعلق رولٹ کمیٹی کی تحقیقات کی رپورٹ مطبوعہ کاشی رام پریس لاہور، دسمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۲۶۔ آئندہ اس کتاب کا نام صرف "رولٹ کمیٹی کی رپورٹ" تحریر کیا جائے گا۔ یہ تمام باب اسی رپورٹ سے ماخوذ ہے۔ - ۱۲

[2] بریندر اور اربندا دونوں بنگالی تھے۔ معزز خاندان کے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۴ پر)

اور تعلیم یافتہ طبقہ میں کام شروع کردیا۔ ان حضرات کی خفیہ کوششیں اپنا کام کررہی تھیں کہ تقسیم بنگال کا مسئلہ پیش آگیا۔

تقسیم بنگال

بنگال کے ہندوؤں کا قدم سیاسیات میں سب سے آگے تھا۔ انکی قوت توڑنے کے لئے وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں اعلان کیا کہ اُن کا ارادہ یہ ہے کہ کمشنری چٹا گانگ ڈھاکہ اور میمن سنگھ کو صوبہ بنگال سے نکال کر آسام میں شامل کردیا جائے۔ اس کے خلاف بنگالیوں نے ہزارہا جلسے کرڈالے اور لاکھوں دستخط کراکر عرضداشتیں بھیجیں اور تمام ملک میں ہنگامہ بپا کردیا اس وقت نواب سلیم اللہ خاں (نواب ڈھاکہ) نے بھی فرمایا کہ یہ ایک وحشیانہ تجویز ہے۔ لارڈ کرزن اس مخالفت کو برداشت نہ کرسکے اور فروری ۱۹۰۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں ہندوستانیوں کے متعلق کہا کہ وہ سچے نہیں ہوتے۔ اور سچ بولنا ہندوستانیوں کا کبھی نصب العین نہیں رہا۔ اس پر بنگالیوں نے ایک طوفان برپا کردیا اور ایک عظیم الشان جلسہ میں لارڈ کرزن اور ان کی پالیسی پر ملامت کی۔ یہ جلسہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس سے لارڈ کرزن کو اس قدر اشتعال ہوا کہ وہ سیدھے ڈھاکہ پہنچے اور وہاں ایک جلسہ عام میں مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ

> "تقسیم بنگال سے اُن کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ گورنمنٹ بنگال کے انتظامی بار کو ہلکا کیا جائے بلکہ اسلامی صوبہ بنانا تھا جس میں مسلمانوں کا غلبہ ہو۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳) ننھیال تھے۔ اُن کے باپ ڈاکٹر ڈی گھوش گورنمنٹ میڈیکل آفیسر تھے۔ بنگلہ نے ولایت میں تعلیم پائی تھی اور سول سروس کے آخری امتحان میں گھوڑے کی سواری کے ناقابل ہونے کے باعث فیل ہوگیا تھا۔ ۱۲ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ۔

یہ وہی ڈھاکہ تھا کہ جو ڈیڑھ سو سال قبل ہندوستان کا صنعتی مرکز تھا۔ جس کی دولت کی دھوم تمام دنیا میں تھی۔ جہاں مسلمانوں کی نوابی اور آزاد حکومت تھی۔ مگر بقولِ سر ولیم ہنٹر جہاں گورنمنٹ کی پالیسی بدل جانیکی وجہ سے مسلمانوں کی زمینداریوں اور اعلیٰ عہدوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ پھر ان پر وہ دور آیا جب کہ وہ معاش سے تنگ ہو گئے اور بے گھر اور بے زر ہو کر ہجرت کرنے لگے وہ سیاسی مقدمات میں سزایاب ہوتے تھے اور افلاس، تنگدستی اور جہالت کی وجہ سے ان کا شمار پست ترین اقوام میں ہونے لگا۔ اس پست حالت پر پہنچنے کے بعد آج جبکہ لارڈ کرزن بذات خود وہاں پہنچکر اُن کی فلاح و بہبود کا نعرہ بلند کر رہے ہیں تو ان پامال انسانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ چرخِ گردوں ان کی مرضی کے سامنے سرنگوں ہو گیا ہے آج ان کا حامی و مددگار کوئی کلکٹر کمشنر یا گورنر نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا بادشاہ اُن کے خانۂ ویران میں رونق افروز ہے۔ بلاشبہ ان کے فہم و قیاس کے بموجب یہ اُن کی انتہائی معراج تھی۔ ایسی صورت میں کام کے لئے تیار ہو جانا اُن کی بھولی بھالی فطرت کا لازمی تقاضا تھا۔ بالخصوص جبکہ کام یہی بتایا جائے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف کھڑے ہو جائیں جنکے ہاتھوں میں اُنکی تمام جائدادیں چلی گئی ہیں۔ جو تمام اراضی کے مالک ہو گئے ہیں۔ جو تمام عہدوں پر قابض ہو چکے ہیں۔ اگرچہ قابض بھی اسی خیال کے عہدہ داروں کی بدولت ہوئے تھے جو اُنھیں آلہ کار بنا کر اُن کے ہمسایوں سے بھڑانا چاہتے ہیں۔ اُس زمانہ کے اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے حسب ذیل اقتباس سے تقسیم بنگالہ کے مقصد کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے۔

(۱) بنگالیوں کی اجتماعی قوت کو توڑنا۔
(۲) کلکتہ کی سیاسی برتری کو گرانا۔
(۳) مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی قوت کو بڑھانا جو اُمید ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی جلد بڑھنے والی قوت کو روکتی رہے گی۔

بہرحال ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۵ء کو صوبہ کی تقسیم کا اعلان ہوا[1] اور بموجب روایت رولٹ ایکٹ کمیٹی ۵ر جولائی ۱۹۰۵ء میں اس کا اعلان ہوا۔ اور اکتوبر ۱۹۰۵ء میں اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ یہ تبدیلی انقلاب پسند طبقہ کو ناگوار تھی۔ اس نے اس کے نقصانات اپنی قوم کو سمجھا کر انقلاب کیلئے برانگیختہ کرنا شروع کردیا۔

احتجاج کے لئے تین صورتیں تجویز کی گئیں۔

(۱) ولایتی سامان کا بائیکاٹ۔
(۲) سودیشی مال کو رواج دینا۔
(۳) دہشت انگیزی (رپورٹ رولٹ کمیٹی)

بہار اور اُڑیسہ

بنگال کی شورش کا اثر لامحالہ بہار اور اڑیسہ پر ہونا چاہئے تھا چنانچہ ۱۱ اپریل ۱۹۰۸ء کو مسٹر کنگسفورڈ جج مظفر پور کو ہلاک کرنے کے لئے بم پھینکا گیا مگر معلوم ہوا کہ قاتلوں نے مس کنیڈی اور مسز کنیڈی دو یورپین لیڈیوں کو قتل کردیا۔ جو جج موصوف کی گاڑی پر سوار تھیں۔

صوبہ آسام

بھی بنگالیوں سے متصل تھا اور چونکہ اس کے ذریعہ سے برما کی ملحق سرحدات میں بے چینی پھیلائی جاسکتی تھی نیز آسام کی پہاڑیوں

[1] روشن مستقبل از صفحہ ۳۴۴ تا صفحہ ۳۴۶ - طبع سوم -

سے دیگر ممالک سے خفیہ اسلحہ وغیرہ کی درآمد آسانی سے ہوسکتی تھی۔ لہٰذا آسام کا متاثر ہونا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ سازش برہما کے مقدمات ان تمام امور پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

سی ۔ پی
صوبہ سی۔پی مرہٹوں کا قدیم عہد سے آماجگاہ رہا ہے۔ صوبہ بمبئی سے ملحق ہے۔ اس پر صوبہ بمبئی کی شورش کا اثر ہوا۔ حتیٰ کہ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کے اجلاس کیلئے ناگپور تجویز کیا گیا تھا۔ مگر کانگریس کی نرم پالیسی نے ناگپور کے گرم جوش نوجوانوں کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ وہاں کانگریس کا اجلاس ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ ناگ پور کے بجائے اجلاس صوبہ بمبئی میں کیا گیا۔

مدراس
۱۹۰۷ء میں بنگال کے نوجوانوں نے مدراس میں بھی کام شروع کر دیا۔ نیز بمبئی کے مرہٹوں نے بنگالیوں کی امداد کی اور یہاں بھی وہی شورش برپا ہوگئی۔ سری نواس۔ آئنگر کا اخبار "انڈیا" اسی سال ضبط ہوا۔ اور سری نواس کو سزا ہوئی۔ پھر ۱۹۱۱ء میں مسٹر ایش ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تناولی کو اسٹیشن پر قتل کر دیا گیا۔

پنجاب
پنجاب میں تحریک آزادی کی نوعیت اگرچہ مختلف تھی مگر دوسرے صوبوں سے کم نہیں تھی۔

اسی سلسلہ میں لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کو ۱۹۰۷ء میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ بھائی پرمانند بھی اسی زمانہ کے انقلابی لیڈروں میں سے ہیں جو ۱۹۱۵ء میں دوبارہ گرفتار کئے گئے اور سزایاب ہوئے۔

دسمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا۔ لارڈ موصوف بچ گئے

ایک اردلی مارا گیا۔ اس سازش کا مرکز بھی لاہور ہی کو قرار دیا گیا تھا۔

صوبہ یو پی ۱۹۱۵ء میں سازش بنارس کا مشہور کیس ہوا اور دیگر اخبارات پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ ضمانتیں ضبط ہوئیں یہ اس صوبہ کے اضطراب کی دلیل تھی۔

مختصر یہ کہ ۱۹۱۵ء کا زمانہ وہ تھا جو بقول سر ڈینزل ایبٹسن لفٹنٹ گورنر پنجاب "ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے۔ ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی اور وہ منتظر تھے کہ دیکھیں اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔" [۱]

انقلابی تحریکات کی قومی و مذہبی نوعیت

رولٹ ایکٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے بموجب یہ تمام تحریکات "ہندوازم" کے ماتحت تھیں۔

(۱) جنوبی مغربی ہندوستان میں انقلابی تحریک کے آثار ابتداءً سالانہ میلوں میں رونما ہوئے۔ جن میں سے ایک تو "دیوتا گنپتی" کے اعزاز میں منعقد ہوتا تھا اور دوسرا مرہٹہ سردار "سیواجی" کے اعزاز میں [۲]

(۲) اس تحریک کا اہم نقطہ یہ تھا کہ سیواجی کے کارنامے قوم کے سامنے پیش کرکے اُن کو انقلاب پر آمادہ کیا جائے۔

چنانچہ سیواجی کے میلہ میں مندرجہ ذیل اشلوک پڑھا جاتا تھا۔ [۳]
محض سیواجی کی کہانی سنا دینے سے ہی آزادی حاصل نہیں ہوتی بلکہ ضروری ہے

---

[۱] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۱۳۰ [۲] ایضاً صفحہ ۱۱ [۳] ایضاً صفحہ ۱۳

کہ لوگ سیواجی اور باجی راؤ کی مانند اولوالعزمانہ جانبازی دکھانے پر آمادہ ہو جائیں۔ بہر حال اے لوگو اب تم کو ڈھال تلوار سے مسلح ہو جانا چاہیئے کہ ہم نے دشمن کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم قومی جنگ کے میدان میں اپنی زندگیوں کو جوکھوں میں ڈال دیں گے اور دشمنوں کے خون سے زمین کو سرخ کر دینگے۔ جو ہمارے مذہب کو ناپاک کر رہے ہیں۔ ہم دشمنوں کو مار کر رہیں گے۔ اور تم عورتوں کی مانند بیٹھے کہانیاں سُنتے رہو گے"۔

(۳) گنپتی کے میلہ کا اشلوک یہ تھا۔

افسوس تم کو اپنی حلقہ بگوشی اور محکومیت پر ذرا افسوس نہیں آتا اس لیئے بہتر ہے کہ خودکشی کر لو، بد طینت لوگ قصائیوں کی مانند جلادوں کی سی بے رحمی سے گاؤں اور بچھڑوں کو ذبح کرتے ہیں۔ اُٹھو اور گئو ماتا کی مدد کرو۔ اس کی تکلیفات کو رفع کرو، مر جاؤ مگر مرنے سے پہلے انگریزوں کو ٹھکانے لگا دو۔ شکست بیٹھ کر زمین پر بارِ گراں کیوں بنے ہوئے ہو۔ یہ ہندوستان ہے پھر اس پر انگریزوں کا تسلط کیوں ہے"۔ [۱]

(۴) ونائک ساورکر۔ آج فرقہ پرست لیڈر ہیں۔ ہندو مہا سبھا کے خاص رُکن ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں اُن کی عمر بائیس سال تھی "جب مہاتما گیہ گوروپرم ہنس" کی رفاقت میں انقلابی سوسائٹی قائم کر رہے تھے اور پھر انڈیا ہاؤس لندن کے آپ مسلمہ لیڈر تھے۔ جس کے ایک ممبر نے ۱۹۰۹ء میں سر ولیم کرزن وائیلی

---

[۱] رولٹ کمیٹی کی رپورٹ ص ۱۳۔ ۱۲

پولیٹیکل ایڈی کانگ کو قتل کر دیا تھا۔

اگر ساورکر آج ہندو پرست لیڈر ہیں تو تعجب نہیں۔ کیونکہ اُس زمانہ میں بھی آپ کی تحریک انقلاب کا مقصد "ہندوازم" تھا۔

(۵) انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس انقلابی جدوجہد میں صوبہ بنگال تمام صوبوں سے پیش پیش اور سارے ہندوستان کا "قائد" رہا۔ لیکن بنگال میں انقلابی تحریک کا آغاز اس طرح ہوا۔

۱۸۸۶ء میں بنگال کے مشہور سوامی رام کرشن کا انتقال ہوا۔ وہ خالص مذہبی شخص تھا۔ وہ ہندوازم کی وکالت کرتا تھا۔ مگر دوسرے مذاہب کو بھی درست مانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام دیوتا نرا کار پرماتما کے ظہور ہیں کالی روحانی طاقت کی دیوی ہے۔ کالی کو ہی وہ اپنی اور تمام کائنات کی ماتا تصور کرتا تھا اس کے مرنے پر اس کے خیالات کی اشاعت کا کام اسکے شاگردوں نے اپنے ذمہ لیا۔ جن میں سے قابل ذکر ایک بھدرالوک نوجوان نریندر ناتھ دت بی۔ اے ہے۔ یہ شخص بعد سوامی "ویکانند" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور سنیاس لینے کے بعد شکاگو کی مذہبی کانفرنس میں ہندوازم کے قائم مقام کی حیثیت سے شریک ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں وہ معہ اپنے چند پیروں کے ہندوستان واپس لوٹا۔ بہت سے ہندوؤں نے اس کو اپنا نجات دہندہ اور اپنے مذہب کا پیغمبر تسلیم کیا۔ اُس نے رام کرشن مشن کے زیر اہتمام رفاہِ عام اور مذہبی کوششوں کے مرکز قائم کئے مگر اپنے گرو کی تلقین سے بہت آگے نکل کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ "ویدانت ہی دنیا کا آئندہ مذہب ہے اور گو ہندوستان اس وقت ایک

غیر ملکی حکومت کے ماتحت ہے۔ تاہم اسے بنی نوع انسان کے اعتماد کو قائم رکھنے کے لئے محتاط رہنا چاہیئے اور شکتی ماتا کی مدد کے بھروسہ پر آزادی حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ لے

(۶) تقسیم بنگالہ نے انقلابی تحریک کو خالص فرقہ وارانہ بنا دیا۔ کیونکہ اس سے حکومت ویدانت کا تخیل پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ بنگال میں ہندو اکثریت ختم ہو رہی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم نے بنگالی ہندو کی اہمیت ہی ختم کر دی تھی اور حکومت و یدانت کا دائرہ محدود کر دیا تھا۔ یہی تخیل تھا جس نے بنگالی نوجوانوں کو موت پر آمادہ کر دیا تھا۔

بے شک! اس تقسیم نے بنگال کو مسلم اکثریت کا ایک صوبہ بنا دیا۔ مگر بنگال میں ہندو مسلم منافرت بھی ہمیشہ کے لئے قائم کر دی۔

(۷) یہی ویدانت کی حکومت کا تخیل تھا۔ جس نے ہندو نوجوانوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ انقلابی پارٹی میں صرف ہندو کو شامل کرتے تھے اور مسلمان کا داخلہ قانوناً ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ اس انقلابی نظام کا نام انوسلین سمتی رکھا گیا تھا۔

(۸) انوسلین سمتی میں داخلہ کے لئے بہت سے حلف لیئے جاتے تھے لیکن حلف کا طریقہ "بریا ناتھ اچارجیہ" نے حسب ذیل بیان کیا ہے۔

درگا پوجا سے پہلے مہیلا کی تقریب پر را مداس اور میں نے اور ڈھاکہ سمتی کے چند دیگر اشخاص نے "رامنہ سد بشوتی" کالی باڑی میں پولن داس کے سامنے حلف اٹھایا۔ ہم دس بارہ آدمی تھے۔ ہم نے ابتدائی آخری اور خاص حلف اٹھایا

لے رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ۔ صفحہ ۲۵

اس وقت کوئی پروہت موجود نہ تھا اور یہ رسم کالی دیوی کے سامنے پانچ بجے صبح ادا کی گئی۔ پورن داس نے ایک اور پوجا کی۔ بعد ازاں کاغذ پر لکھی ہوئی قسمیں پڑھی گئیں اور ہم نے اُن پر قائم رہنے کا وعدہ کر لیا۔ خاص حلف دینے کی رسم کالی دیوی کے رُوبرو بائیں گھٹنے کے بل ہو کر ہاتھ میں گیتا اور تلوار لئے ہوئے ادا کی گئی۔ گھٹنے کے بل ہونے سے پرتیالرھا کا آسن بنتا ہے جس سے تیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے شخص نے اس طرح بیان کیا ہے مجھے "پورن" کالی پوجا کے دن گھر سے بُلا کر لے گیا۔ اور ہم سب نے اُس دن فاقہ کیا۔ رات کے وقت پورن ہم سب کو شمشان بھومی میں لے گیا۔ وہاں پہلے سے کالی دیوی کے پاؤں پر دو ریوالور رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے مورتی کو ہاتھ لگایا اور ممتی کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا۔ اس وقت ممتی کی طرف سے ہمارے نئے نام تجویز کئے گئے۔ لہ

(۹) بظاہر پنجاب کی تحریک میں ہندوازم کا تخیل اس قدر مضبوط نہ تھا مگر تاہم اس کے لیڈر بھائی پرمانند اور لالہ لاجپت رائے تھے۔

بھائی پرمانند کے جذبات آج دنیا کے سامنے ہیں۔ بظاہر یہ جدید جذبات نہیں۔

(۱۰) کانگریس اس تمام دور میں کمزور رہی۔ اگرچہ ۱۹۰۶ء میں اس نے بائیکاٹ کی تصویب اور تقسیم بنگالہ کی مخالفت کی تھی۔ مگر ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ اُن تمام پارٹیوں کے نصب العین کے برخلاف ہندو مسلمان کی تفریق

لہ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۶۔

کو گوارہ نہ کرتی تھی۔ اور وہ ایک جماعت بنانا چاہتی تھی جو اختلاف مذاہب کے باوجود نزاع اور ملکی مفاد کے نقطہ پر متفق ہو کر تمام ہندوستانیوں کو ایک نیشن بنانے

انقلابی جماعتوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی

"برن ہارڈی" نے اپنی کتاب "جرمنی اور آئندہ جنگ" میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ بنگال کے لوگوں میں قومی اور انقلابی تحریک جاری ہے۔ اگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے متفق ہو جائیں تو ان کی شرکت عمل سے انگلستان کا بلند درجہ جو اُسے اقوام عالم میں حاصل ہے مخدوش ہو سکتا ہے۔ [۱]

ایک شخص مسمّٰی ہردیال جو کبھی دہلی کا باشندہ اور پنجاب یونیورسٹی کا ایک ہندو طالب علم تھا، ۱۹۰۵ء میں سرکاری وظیفہ حاصل کر کے آکسفورڈ میں تکمیل کی غرض سے انگلستان گیا۔ اُس نے اپنا وظیفہ اور آخری قسط واپس کر دی اور بیان کیا۔ کہ میں انگریزی طریقۂ تعلیم کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ واپس آیا اور ایک انقلابی پارٹی تیار کی۔ [۲]

۱۹۱۱ء میں سان فرانسسکو (امریکہ) پہنچا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مختلف مقامات پر جلسے کر کے لیکچر دیے اور ایسی انجمنیں قائم کیں جنھوں نے ہندوستان سے سلطنت برطانیہ کو ختم کرنے کی قسمیں کھائیں اُس نے

---

[۱] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صہ ۱۵۹ [۲] ایضاً صہ ۱۵۸

"غدر" کے نام سے ایک اخبار نکالا جس کا پہلا پرچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو شائع ہوا[1] جو کثیر تعداد میں ہندوستان میں تقسیم ہوتا تھا۔

جس میں باغیانہ اشتعال انگیز مضامین شائع کئے جاتے تھے اور خفیہ انجمنوں کے بنانے کی تلقین ہوتی تھی۔[2]

اخبار کے علاوہ موقعہ بموقعہ پمفلٹ بھی شائع کئے جاتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ "غدر" کے نام سے اشتعال انگیز نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ ایک نظم میں تلک، لیاقت حسین، برکت اللہ، موکی جیت سنگھ، ساورکر، اربند گھوش، کرشنا ورما، ہردیال وغیرہ وغیرہ کی تعریفیں کی گئیں۔[3]

اُس کے ساتھیوں میں زیادہ قابلِ ذکر دو آدمی ہیں۔ ایک ہندو مسمی

---

[1] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صہ ۲۲، ۱۲

[2] دلچسپی کے لئے ایک مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

بہادرو جلدی کرو غدر برپا کر کے ان تمام ٹیکسوں کو بند کر دو جو ہم سے وصول کئے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے ایسے بہادر سپاہیوں کی جو ہندوستان میں غدر پھیلائیں۔ موت تنخواہ ہے شہادت انعام ہے۔ آزادی پنشن ہے۔ میدان جنگ ہندوستان ہے۔ اُٹھو۔ آنکھیں کھولو۔ غدر کے لئے روپیوں کی تھیلیاں بھرو۔ ہندوستان پہنچ جاؤ۔ اور آزادی کے لئے جانیں قربان کر دو (رولٹ کمیٹی کی رپورٹ صہ ۳۲)۔ ۱۲

[3] رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ صہ ۲۳۔ ۱۲

رامچندر۔ دوسرا مسلمان مسمیٰ برکت اللہ ؎

ہردیال نے اپنے تمام ساتھیوں کو سمجھایا کہ انگلستان پر جرمنی عنقریب حملہ کرنے والا ہے اور یہی وقت ہے کہ ہم ہندوستان پہنچکر کام کریں۔ ؎

ہردیال اور اس کے ساتھیوں کے تمام واقعات موضوع کلام سے خارج ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ پارٹی امریکہ، فلپائن، ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور، چین مصر، ترکی، افغانستان وغیرہ تمام ممالک میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس پارٹی میں ہندو، مسلمان، سکھ، تینوں قومیں شریک تھیں۔

ترکی اور جرمنی اُس کی پشت پر تھے۔ مختلف جہازوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں رائفلیں اور سامان جنگ نیز نقد روپیہ پہنچانے کی کوشش کیگئی اخبار غدر کی طرح ایک دوسرا اخبار "جہان اسلام" مئی ۱۹۱۴ء کے قریب قسطنطنیہ سے جاری کیا گیا۔ اس میں عربی، ترکی اور اردو ہندی کے مضامین ہوتے تھے۔ اُس کا اُردو حصہ پنجاب کا ایک باشندہ ابو سعید تیار کرتا تھا جو ۱۹۱۲ء تک مدراس اور کسی زمانہ میں رنگون کا کلرک تھا اور جب ترکی اور اٹلی کی جنگ چھڑی تو وہ مصر چلا گیا تھا۔ اعلان جنگ کے بعد اس اخبار کا اُردو حصہ ہردیال کا لکھا ہوا تھا۔ اور مصر کے نیشنلسٹ لیڈروں یعنی فرید بے اور منصور عرفت نے بھی برطانیہ کے خلاف مضامین لکھے تھے۔

۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں انور پاشا کی ایک تقریر درج کی گئی تھی

؎ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ ص ۳۰ ؎ ۱۴ اگست ۱۹۱۵ء

جس میں اور بہت سی باتوں کے علاوہ انور پاشا مرحوم نے یہ بھی کہا تھا کہ

"ہندوستان میں غدر برپا کیا جائے۔ انگریزی اسلحہ خانوں کو تاخت و تاراج کر کے اسلحہ لوٹ لئے جائیں اور انھیں ہتھیاروں سے انگریز مار ڈالے جائیں۔ ہندوستان میں ہندوستانی بتیس کروڑ اور انگریز صرف دو لاکھ ہیں ان سب کو قتل کر دینا چاہیئے۔ ان کے پاس فوج بالکل نہیں ہے

ترک نہر سویز کو عنقریب بند کرنے والے ہیں لیکن وہ جو اپنے ملک و وطن کو آزاد کرنے کی کوششوں میں جان دے گا ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اے ہندو اور مسلمانو تمھیں دونوں انگریزی فوجوں کے سپاہی ہو۔ تم آپس میں بھائی ہو نیچ اور کمینے انگریز تمہارے دشمن ہیں۔ تم جہاد کا اعلان کر کے غازی بن جاؤ۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو قتل کر دو اور ہندوستان کو نجات دلوادو"[1]

ہردیال ستمبر ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ گیا تو ابو سعید کے پاس ٹھیرا۔

ابو سعید کی تجویز پر "ینگ ٹرکش پارٹی" کے ایک ممتاز ممبر "توفیق بے" ۱۹۱۳ء میں رنگون آتے۔ اور رنگون کے ایک تاجر کو ترکی قنصل بنایا۔

رنگون اور برما کی داستان بھی طویل ہے اور موضوع بحث سے خارج۔

اس سلسلہ میں خصوصیت سے مندرجہ ذیل حضرات کے نام لئے جاتے ہیں۔

---

[1] رولٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۴۰ و ۲۴۱۔

(۱) سید مجتبیٰ حسن عرف مولچند۔ (۲) علی احمد صدیقی (۳) حکیم فہم علیؔ (۴) حسن خاں۔ ہردیال اور ہندوستان کے دیگر انقلاب پسندوں نے ۱۹۰۵ء میں برلن میں "انجمن انقلابِ ہند" بنائی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ اس کے مسلسل جلسے ہوتے رہتے تھے جن میں ترک رومی، جرمن آفیسر شریک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسے جلسے ہوتے تھے جن میں جرمن اور ہندوستان کے مشترکہ مقاصد پر بحث ہوتی تھی۔ (رولٹ کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۲۲۶)

لہ ـــــــــ یہ بزرگ ۱۹۴۳ء تک زندہ رہے۔ شیعہ تھے مگر شیعت سے ناواقف۔ حریت کے فدائی۔ چین کے انقلاب میں حصہ لیا۔ پھر اس پارٹی میں گرفتار ہوئے تو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ پھر خاص خاص سفارشوں کے سبب عین پھانسی کی تاریخ کو حکم پہنچا کہ پھانسی منسوخ کی جائے۔ پھر چند دفعات میں ان کو ۴ سال کی سزا دی گئی۔ مگر جب بیس سال جیل خانہ میں رہ کر سارے قویٰ معطل ہو گئے تو ان کو رہا کر دیا گیا۔ ۳۰ء میں فیض آباد جیل میں تقریباً ایک سال احقر کا موصوف کے ساتھ رہنا ہوا۔ انقلاب کی زندہ تاریخ تھے۔ رہائی کے بعد کانگریس کمیٹی صوبہ یو۔ پی کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ ۳۸ء میں دفتر صوبہ میں ملاقات ہوئی ایک شعر بڑھاپا جوان کی حالت کا مرقع تھا۔ خریدار کا حصہ ہے زخم بالخ کا، میں وہ دانہ ہوں جو گراگفہ میزاں سے۔ ہندوستان کی سی، آئی ڈی بہت زیادہ قابل واقع ہوئی ہے اگی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ حکیم فہم علی کے دھوکہ میں شہر مراد آباد کے امام مولوی قاسم علی صاحب کو گرفتار کر لیا اس زمانہ میں مصر سے واپس آئے تھے۔ امام صاحب گورنمنٹ کے ازلی وفادار ان جھگڑوں سے ناآشنا۔ بہر حال ایک مصیبت تھی جو آگئی اور بڑی مصیبت سے نجات ملی۔

ان مسلسل واقعات اور اس پیہم جدّوجہد کا نتیجہ یہ تھا کہ فروری ۱۹۱۵ء میں ایک تاریخ مقرر کی گئی جس میں ہندوستان کے مختلف مقامات اور چھاؤنیوں پر حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا گیا۔ مگر حسب ضرورت اسلحہ فراہم نہ ہو سکنے کے باعث یہ تاریخ خالی گئی اور اس کے بعد گورنمنٹ کو اُس کا سُراغ لگ گیا۔

مذکورہ بالا تحریر سے آپ کو مندرجہ ذیل اُمور کا اندازہ ہو گیا۔

۱ — ۱۸۹۳ء سے ۱۹۱۵ء تک ہندوستان کی سیاست تشدد پسند بنیاد پر تھی۔

۲ — دہشت انگیزی اور تشدد کے اُصول پر ہی انقلاب کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا تھا۔

۳ — یہ تمام جماعتیں ایک دوسرے سے منسلک نہیں تھیں۔

۴ — جب امور تحریک کا تعلق بیرونی ممالک سے ہوا تو وطنی رابطہ نے ان سب کو انگریز کے مقابلہ کے لیے متحد کر دیا۔

تحریک شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ

بیان ہو گذر چکا کہ ۱۲۹۷ھ تقریباً ۱۸۷۹ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے ایک جمعیۃ قائم کی تھی جس کا نام "ثمرۃ التربیت" تھا (تربیت کا پھل)

اس انجمن کا نام خود ایک لائحہ عمل کی خبر دیتا ہے۔ اور انجمن کا قیام واضح کرتا ہے کہ مذکورہ بالا تمام انقلابی جماعتوں سے بیشتر علمارِ ملت نے ایک ایک بنیاد قائم کر دی تھی

(۲) شاندار ماضی کی جلد دوم میں ہم نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ حضرت سید

صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی تجویز یہ تھی کہ سرحد افغانستان اور ایران کی حکومتیں ایک نظریہ پر متحد ہو جائیں۔ پھر ۱۸۵۷ء سے پیشتر شاہ ایران نے بھی اس کی دعوت دی۔ حضرت شیخ الہند کے جذبات بھی یہی تھے۔

سلاطین اسلام کے زمانہ میں کابل ہندوستان کا جز رہا ہے۔ انگریزوں نے بھی اس کا ارادہ کیا مگر ناکام رہے۔ حضرت سید صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی جدوجہد نے ہندستانی اور سرحدی مجاہدین میں ایک رابطہ قائم کر دیا جو انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات کے زمانہ ۱۸۶۴ء تک یعنی ثمرۃ التربیت کے تقریباً پندرہ سال پیشتر تک استحکام کے ساتھ باقی رہا۔ ان مقدمات کے بعد امداد رسانی کا وہ تعلق ختم ہو گیا۔ مگر مجاہدین کا رابطہ ختم نہیں ہوا۔ ہندوستانی مجاہدین سرحدی علاقوں میں باقی رہے دارالعلوم دیوبند نے اس رابطہ کو استادی اور شاگردی کی شکل میں تبدیل کر دیا جو انقلابی جدوجہد کے لئے پہلے سے بہت زیادہ مستحکم اور مفید ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ مولانا محمود الحسن صاحب جیسا سیاسی اور مذہبی مقتدا نہ صرف اُستاذ بلکہ شیخ اور پیر بھی ہو جس کے دست حق پرست پر سلوک و طریقت کے لئے بھی بیعت کی جاتی ہو اور جہاد کے لئے بھی۔[1]

(۴) تحریک کی تقویت کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ خود ہندوستان کے مسلمان ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں۔ اسی مبارک جذبہ نے ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم

---

[1] حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی (صہ۲۵ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت)

حکیم اجمل خاں صاحب۔ مولانا محمد علی صاحب۔ مولانا ابوالکلام صاحب جیسے مدبرین کو حضرت شیخ الہند کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا اور کوشش کی جا رہی تھی کہ علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ کی دونوں عظیم الشان یونی ورسٹیوں "دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج" میں مفادِ ملت کے اصول پر آئینی اتحاد و اتفاق کا رابطہ قائم ہو جائے۔

(۵) اور جبکہ یہ تحریک نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ وطن عزیز اور وطن عزیز کے تمام باشندوں کے لیئے تھی۔ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ ۱۸۵۷ء کی طرح برادران وطن کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ راجہ مہندر پرتاب اور ان کی پارٹی سے رابطہ اسی نظریہ کا عملی پہلو تھا۔

(۶) ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کا ہنگامہ خیز دور جس میں بقول سر وینزل ایٹنس لفٹننٹ گورنر پنجاب "ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے۔ اُن کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی۔ وہ منتظر تھے کہ اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے"، حضرت شیخ اور آپ کی جماعت کیلئے ایک حیات بخش دور تھا۔ جس کی تمہید خفیہ طور پر تین سال پیشتر سے کی جا چکی تھی۔ چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں اسکو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا۔ جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جس کی مقبولیت بھی اسی طرح ہمہ گیر ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کا جلسہ دستار بندی

اس نظام کو عام ذہنوں تک پہنچانے کے لئے مناسب سمجھا گیا کہ سب سے پہلے خالص مذہبی پیرایہ میں اس کا ظہور ہو جو اس وقت کی سیاست کے لحاظ سے نہایت ہی مبصرانہ اقدام تھا۔

چنانچہ ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۰ء میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں ہندوستان کے اطراف واکناف سے تقریباً تیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔

یہ اجتماع اُس زمانہ تک ہندوستان کی کسی جماعت کو نصیب نہیں ہوا تھا اس لیے اس اجتماع کو اور پھر اُس سے زیادہ اُس کے حسن انتظام کو کرامت[لہ] خیال کیا گیا۔ مگر جن حضرات کی نظر اُس کی ستائیس سالہ تمہید پر تھی وہ اس پر اس قدر تعجب نہیں کرتے تھے اگرچہ کامیابی پر بہت زیادہ مسرور تھے۔

اس تمہید ہی کی برکت تھی کہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے علماء اور زعماء نے اس اجتماع میں شرکت فرمائی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علی گڈھ کالج میں انگریزی پڑھنے جایا کریں اور علی گڈھ کے گریجویٹ عربی پڑھنے کے لئے دیوبند آیا کریں۔

یہ تجویز نہایت مبارک خیال کی گئی اگرچہ اس کا ثمرہ نہایت تلخ تھا۔ یعنی پہلی مرتبہ جو علی گڈھ سے عربی حاصل کرنے کے لئے آئے وہ انگریز کے سی، آئی، ڈی تھے۔ جنہوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرانے میں طلائی سعی اور قوم پروری کا حق ادا کرکے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی۔آئی۔ڈی کا عہدہ حاصل کر لیا۔

لہ اس جلسہ میں حسن انتظام۔ برکت طعام وغیرہ وغیرہ کے عینی مشاہدوں نے اس جلسہ کو کرامت قرار دیا۔ تقریباً تیس ہزار کا اجتماع تھا مگر کھانے وغیرہ کا خرچ اس قدر قلیل کہ جس کو صرف کرامت اور برکت ہی کہا جا سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس تمام مجمع کو صرف دو ڈھائی گھنٹہ میں کھانا کھلا دیا جاتا تھا جبکہ نہ کوئی شور وشغب ہوتا تھا نہ بدنظمی اور پریشانی۔ یہ امر بھی خلاف معمول اور خلاف عادت تھا، کہ تمام کیمپ بازار کھانا پکنے اور کھانا کھلانے گوشت بنانے

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۳۲ پر)

جمعیۃ الانصار کا سب سے پہلا اجلاس

جلسہ دستار بندی فضلاء دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جمعیۃ الانصار کے اجلاس کی تیاری کی گئی "شہر مُرادآباد" کو یہ شرف حاصل ہے، کہ جمعیۃ الانصار کا سب سے پہلا اجلاس شوال ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو اسی سرزمین میں ہوا۔ اس جلسہ کا اجتماع بھی حیرت انگیز تھا اور باوجودیکہ پلیگ کی شدت تھی۔ تاہم اجتماع بے نظیر اور انتظام قابل رشک تھا۔

کرامت یا حُسن اتفاق

پلیگ کی شدت کے باعث کلکٹر صاحب مُرادآباد نے ان تاریخوں میں جلسہ کی ممانعت کردی تھی منتظمان جلسہ نے کلکٹر صاحب سے کہا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ علماء کی تشریف آوری سے پلیگ جاتا رہے گا۔ اظہار عقیدت کا اندازہ کچھ ایسا تھا کہ کلکٹر بھی متاثر ہوا۔ اُس نے اجازت دیدی اور قادر مطلق کے فضل و کرم نے اس عقیدہ کی تصدیق بھی کردی چنانچہ اس جلسہ کے آغاز کے ساتھ شہر سے طاعون ختم ہوگیا۔ جمعیۃ الانصار کے ناظم حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی تھے آپ نے جلسہ کی روئیداد میں تحریر فرمایا تھا۔

رمضان ۱۳۲۷ھ کی ستائیسویں شب بھی عجیب زندگی بخش اور متبرک شب تھی۔ جبکہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمعیۃ الانصار کے افتتاح کی درخواست کی اور گو جمعیۃ کے وسیع مقاصد ہم غریبوں کے پیمانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱) کے مقامات میں حشرات اور موذی جانور گویا تھے ہی نہیں۔ بہت مرتبہ تجسس کیا گیا مگر خیال کی تغلیط نہیں ہوئی۔ رات بھر کیمپ میں ڈیرہ دن سے باہر کھانا رکھا رہتا تھا مگر کوئی جانور پاس نہ آتا تھا۔ ملاحظہ ہو روئداد جلسہ دار العلوم ۱۳۲۸ھ ۱۲۰

مقدرت سے زائد معلوم ہوتے تھے۔ مگر ہمارے اکابر نے اپنی عالی قدر تائید و امداد کے وعدہ کے ساتھ ان کو شرفِ قبول بخشا۔ اور غایت شفقت سے جمعیۃ کی سرپرستی منظور فرمائی۔ جن لوگوں نے اس وقت جمعیۃ کے بلند مقاصد پر نظر فرما کر شیخ چلی کے خیالات سے تشبیہہ دی تھی۔ وہ بے شک ہماری خستہ حالی اور بے سروسامانی کے اعتبار سے بالکل درست تھی۔ لیکن میں معاف کیا جاؤں اگر یہ کہوں کہ انھوں نے ہمارے بزرگوں کی ہمت و اخلاص اور توجہ الی اللہ کا ہرگز کافی طور پر اندازہ نہ کیا تھا۔ رسالہ القاسم بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ صفحہ ۵

اس جلسہ کے صدر حضرت مولانا احمد حسن[۱] صاحب امروہی قدس اللہ سرہ العزیز تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار[۲] اولڈ بوائز ایسوسی

---

[۱] حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی قدس اللہ سرہ العزیز۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے نہایت محبوب شاگرد تھے۔ تبحر علمی میں حجۃ الاسلام کے صحیح جانشین مانے جاتے تھے سیاسی خیالات میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے رفیق تھے مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی

[۲] اکابر سے موثوق طور پر سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے اس تحریک سے پیشتر حضرت مولٰنا عبد الرحیم صاحب رائپوری حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو جمع کر کے زمانہ کی موجودہ ضرورتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے تو ضعف قلب کا عذر کر کے معذرت کر دی اور باقی سب حضرات نے موافقت فرمائی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایشن کی نقل ہے۔ لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں۔ جمعیۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس برس پہلے شروع ہو گئی تھی۔ اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالبعلم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور آفتاب فنون ہیں اور جن کی ذات بابرکات پر آج زمانہ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔

لیکن یہ تحریک اُس وقت ضروریات سے متعلق نہ تھی اس لیے رُک گئی اور آخر اِس کلیہ کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے۔ ۱۳۲۷ھ سے اس انجمن کو دوبارہ زندہ کر کے جمعیۃ الانصار نام رکھا گیا۔ جمعیۃ الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اُس کا تعلق ہے بلکہ اُس کے مقاصد وہ ضروری مقاصد ہیں جن کی آج بہت کچھ ضرورت ہے۔ (الفاظ کی جامعیت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ یہی ہیں وہ علماء جن کو کہا جاتا ہے سیاست کیا جانیں)

جلسہ انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ مگر اُس نے انگریزوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ اُس وقت تک ہندوستان اس قسم کے جلسوں سے ناآشنا تھا۔

حضرت شیخ الہند کی سیاسی پارٹی

اگرچہ جلسہ میں حکومت کا شکریہ بھی تجویز کی شکل میں پیش کیا گیا مگر انگریز کی بدگمانی دور نہ ہوئی۔

ہندوستان کے دیگر زعماء مثلاً ڈاکٹر انصاری۔ حکیم اجمل خاں۔ مولانا محمد علی صاحب مرحوم۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ تھے ڈاکٹر انصاری تو باقاعدہ حضرت شیخ سے بیعت تھے۔

۱۹۱۲ء میں دنیائے اسلام پر ایک نئی مصیبت آئی۔ جبکہ بلقان کی ریاستوں کو شاطر برطانیہ اور اس کی ہمنوا حکومتوں نے ترکوں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ اور بلقانیوں کے ذریعے ترکوں کے مقابلہ پر وہی کرانا چاہا جو جرمنی اور اٹلی نے اسپین میں جنرل فرانکو کے ذریعہ سے جمہوری حکومت کے مقابلہ میں کرایا۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لئے مسجد کو شہید کرا دیا مسلمانوں نے مسجد کی حمایت میں اپنے سینے پیش کر دیئے جو ظلم پرور فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

ان دونوں ہنگاموں نے حامیانِ ملت کو ایک نقطہ پر جمع کر دیا۔ آزاد حکومت کے قیام کی جدوجہد تیزی سے جاری ہو گئی اور دہلی میں "نظارۃ المعارف" قائم کر کے نوجوانانِ ہند کو درس سیاست دیا جانے لگا۔

اس موقع پر حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے بیان[۱] کے چند فقرے حضرت شیخ الہند رح کے کارناموں کا نشان بتلاتے ہیں۔

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لئے حکم دیا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی[۲] سے کے ساتھ شریک تھے پھر حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں

---

[۱] مولانا سندھی نے اپنے حالات مختصر طور پر پریس کو دیے تھے جو اخبار الجمعیۃ وغیرہ میں شائع ہوئے پھر رسالہ قائد مراد آباد ماہ ربیع الاول میں شائع ہوئے۔

[۲] مولانا احمد علی صاحب مفسر مہتمم انجمن خدام الدین لاہور۔ ۱۲

"نظارۃ المعارف" قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیجکر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لیئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔

۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہ کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان میں پہنچگیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے اُنھوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے۔

کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمائندہ تھے اُس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے ایک خادمِ شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ العالی نے "سفرنامہ شیخ الہند

اسیر مالٹا" میں تحریر فرمایا ہے۔

"بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کے دل و دماغ پر نہایت عجیب ، مگر بے چین کُن اثر ڈالا چنانچہ اُس وقت حسب طریقہ اُستاذ اکبر مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز بزمانہٗ جنگ روس) مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی۔ فتوے چھپوائے۔ مدرسہ کو بند کر دیا۔ طلبہ کے وفود بھجوائے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے ، چندے کیے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی۔ مگر اس پر بھی چین نہ پڑا۔ کیونکہ جنگ بلقان کے نتیجہ نے دُور بینوں کو بالکل غیر مطمئن کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ یورپ کے سفید عفریت اسلام کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ پھر ذمہ داران برطانیہ مسٹر اسکویتھ وغیرہ کی روباہ بازیاں خرس رُوس کی جفا کاریاں تو یقین دلاتی تھیں کہ تقسیم ٹرکی اور اجزار وھایا رگلیڈسٹوں کا زمانہ سر پر ہی آگیا ہے"[1]

الحاصل مولانا نے تھوڑی مدت میں بہت کچھ کامیابی حاصل کر لی اور کام کرنے والوں کے لئے شاہراہ عمل قائم کر دی۔ اصحاب دل اور اہل درد خوشی خوشی مولانا کے ہمراز ہو گئے اور علاوہ اس کے اور بھی بہت سے کام ہو گئے۔ اسی اثنار میں فلک نے نیا گل کھلایا اور جنگ عمومی کی تیرہ و تاریک بنیاد پڑ گئی۔ سارے عالم میں خون کے

---

[1] سفرنامہ شیخ الہند صہ

فوارے بہ نکلے۔ بستیاں کی بستیاں برباد ہونے لگیں۔ بحر و بر میں فتنہ و فساد پھیل گیا۔

گورنمنٹ پرستوں کا فتنہ

وہی ترکی جس کو انگریز نے اپنی ضرورت کے وقت ہندوستانی مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیا تھا اور خلافتِ عثمانیہ کا شاندار تعارف کرا کر خلیفۃ المسلمین سے۔ برطانیہ کی دوستی کا اعلان کرایا تھا۔ اور اس طرح ہندوستانیوں کو سلطانِ ٹیپو وغیرہ سے علیحدہ کر کے اپنا غلام بنایا تھا۔ اب وہی ترک چونکہ میدانِ جنگ میں انگریز کے مقابلہ پر تھا تو اسکو فاسق فاجر قرار دیکر خلافت کا غیر مستحق گردانا۔ گورنمنٹ پرست مولویوں نے فتوے مرتب کیا۔ مولوی عبدالحق حقانی اس فتوے کے موجد اور مؤلف تھے۔ حضرت مولانا کی خدمت میں یہ فتویٰ دو مرتبہ پیش کیا۔ حضرت موصوف نے سختی سے رد کر دیا اور جن لوگوں نے اس کی تصدیق کی تھی اُن کے متعلق بھی سخت کلمات کہے۔ مجمع عام میں اس کو پھینک دیا۔

سفرِ حجاز

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کو افغانستان اور آزاد قبائل میں کام کرنے کے لئے پہلے سے بھیجا جا چکا تھا اور اس طرح تحریک کا رابطہ براہ راست امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان سے قائم ہو چکا تھا لیکن انقلابی جد و جہد کیلئے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات کا قائم کرنا بھی ضروری تھا۔

علاوہ ازیں مولانا محمد علی صاحب وغیرہ کو حکومت ہند نظر بند کر چکی تھی اور حضرت شیخ الہند کے متعلق بھی یہی منصوبہ بروئے کار آنے والا تھا جو انقلابی مقاصد کے لئے مضر ہوتا۔ لہٰذا حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے حج بیت اللہ کا قصد

فرمایا۔ جس کے لئے شوال ۱۳۳۳ھ میں دیوبند سے روانہ ہو گئے۔

روانگی جہاز عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری مرحوم اور بزرگ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم نے اس سفر میں بہت زیادہ مدد دی۔ حکیم صاحب مولانا سے پہلے بمبئی پہنچ گئے۔ جائے قیام۔ ٹکٹ اور ہر قسم کا سامانِ سفر نہایت فراخدلی سے مہیا کر دیا۔

رفقاءِ سفر مولانا کی روانگی معمولی روانگی نہ تھی۔ بہت سے حقیقی اور مصنوعی اربابِ عقیدت ساتھ ہو گئے۔ جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں۔ مولانا محمد میاں صاحب انبیٹھوی۔ مولانا عزیر گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری۔ حاجی خان محمد صاحب۔ مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب دیوبندی۔ حاجی محبوب خاں صاحب سہارنپوری۔ حاجی عبدالحکیم صاحب وبنجی مولانا وحید احمد صاحب رحمۃ اللہ مدنی۔

خفیہ پولیس افواہ گرم ہوئی کہ حضرت مولانا کے ساتھ ساتھ آٹھ سی۔ آئی۔ ڈی۔ جہاز میں چل رہے ہیں۔ اس کی اطلاع شدہ شدہ ترکی پولیس تک پہنچ گئی۔ چنانچہ مشتبہ حضرات حراست میں لے لئے گئے اور اسی طرح زیرِ حراست ان کو حج کرایا گیا۔ [۱]

وارنٹ گرفتاری حکام بمبئی کو بذریعہ تار گرفتاری کا حکم دیا گیا۔ مگر کثرت اجتماع کے باعث پولیس کی ہمت نہ پڑی۔ پھر جہاز پر

---

[۱] سفرنامہ شیخ الہند صفحہ ۱۱۔ ۱۲

کپتان کو تار دیا گیا۔ مگر یہ تار اس وقت ملا جبکہ حضرت شیخ الہند جزیرۂ سعد میں قرنطینہ کے لئے اتر چکے تھے۔ ؎۱

داخلہ مکہ معظمہ ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ اونٹ کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کی شام کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

غالب پاشا سے ملاقات غالب پاشا مکہ معظمہ کے گورنر تھے مکہ معظمہ پہنچکر حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرّہ العزیز نے پاشا موصوف سے ملاقات فرمائی اور اپنی تجویز اور اس کے متعلق کامیابی کی توقع پیش فرما کر امداد کا مطالبہ کیا۔ غالب پاشا کو پیشتر سے حضرت شیخ سے تعارف کرایا جا چکا تھا۔

غالب پاشا نے حضرت شیخ کو چند مکتوب عنایت فرمائے۔ جن میں سے ایک مکتوب "بصری پاشا" گورنر مدینہ طیبہ کے نام تھا جس میں فرمائش کی تھی کہ حضرت شیخ کی ملاقات انور پاشا اور جمال پاشا سے کرادیں۔

اس کے علاوہ استنبول وغیرہ کے حکام اور دیگر ارکانِ حکومت کے نام بھی غالب پاشا نے خطوط لکھ کر حضرت شیخ کو دیئے تھے۔

حضرت شیخ مدینہ طیبہ پہنچے۔ بصری پاشا سے ملاقات فرمائی۔ غالب پاشا کا مکتوب بصری پاشا کو دیا۔ بصری پاشا نے انور پاشا کو بلانے کا وعدہ کیا۔

؎۱ سفرنامہ شیخ الہند صلا ۱۲

ایک بھولے بھالے بزرگ

حضرت شیخ کے پرانے دوستوں میں سے ایک صاحب اسی سال حج کیلئے تشریف لیگئے تھے۔ یہ صاحب باوجودیکہ ایک پاکباز زاہد اور نیک نفس عالم تھے۔ مگر سیاسیات سے بیگانہ اور اہل زمانہ کی چالاکیوں سے بے خبر، یہ صاحب حضرت شیخ الہند کے ہمراہ مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ ان کے علمی تبحر، سادگی اور نیک نفسی کی بنا پر حضرت شیخ ان کا احترام فرماتے تھے۔

بدقسمتی سے پنجاب کے کچھ لوگ جو بظاہر بہت نیک تھے۔ مگر درحقیقت یہ گورنمنٹ برطانیہ کے فرستادہ تھے۔ مدینہ طیبہ کی پولیس کو اُن پر شبہ ہوا اور اُن کو گرفتار کر لیا چونکہ بزرگ صاحب موصوف اُن کی ظاہری دیانت سے متاثر تھے۔ لہٰذا حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو بزرگ صاحب نے مجبور کیا کہ بصری پاشا گورنر مدینہ طیبہ سے ان کی سفارش کریں۔ مولانا حسین احمد صاحب نے بہت کچھ معذرت کی لیکن آخر کار مجبور ہوکر ان گرفتاروں کے متعلق بصری پاشا سے ملاقات فرمائی۔

گورنر صاحب نے سفارش منظور فرمائی اور خاص احتیاط کے ساتھ اُن لوگوں کی رہائی کا حکم فرما دیا۔ لیکن یہ رہائی پولیس کمشنر کی منظوری کے خلاف تھی اور اُس کو اس سفارش سے شکایت پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصری پاشا انور پاشا کو دعوت دینے میں پیش و پیش کرتا رہا۔

ابن شیر خدا مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ کے ہمراہ تھے آپ کے طویل و عریض خطوط جو اردو زبان میں ہوتے تھے سنسر میں پکڑے گئے جن سے پولیس افسران کی بدگمانی ان حضرات کے متعلق اور بھی

زیادہ ہوگئی۔

"انور پاشا" وزیر جنگ کی حیثیت رکھتے تھے اور جمال پاشا جنوبی اور غربی محاذ یعنی سویز۔ سینا اور حجاز کے کمانڈر تھے۔

انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات

"بصری پاشا" گورنر مدینہ طیبہ انور پاشا کو دعوت دینے میں ہنوز پس و پیش کر رہے تھے کہ جنگی ضرورتوں کی بنا پر خود انور پاشا اور جمال پاشا کو "مدینہ طیبہ" حاضر ہونا پڑا۔

ان حضرات کا مدینہ طیبہ میں حاضر ہونا۔ دربار رسالت پناہ میں عجز و انکسار، اہل مدینہ اور اہل مکہ پر انعامات کی بارش۔ اِن حضرات کی مذہبیت، للہیت وغیرہ کی تفصیلات سفرنامہ شیخ الہند میں ملاحظہ فرمائی جائیں۔

سفرنامہ شیخ الہند میں اگرچہ اس موقع پر حضرت شیخ کی خصوصی ملاقات سے انکار کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز نے انور پاشا اور جمال پاشا مرحوم سے ملاقات فرمائی۔ کام کا نقشہ سمجھایا۔

انور پاشا اس چیز کے پہلے سے متمنی تھے۔ انھوں نے حضرت شیخ سے امداد کا وعدہ فرمایا اور چند وثیقے تحریر کرکے حضرت شیخ کو دیے جس میں آزاد قبائل کے باشندگان کو امداد کا اطمینان دلایا گیا تھا وغیرہ وغیرہ

انور پاشا کی رائے تھی کہ حضرت شیخ آزاد قبائل میں بنفس نفیس پہنچیں حضرت شیخ کی خواہش یہ تھی کہ بحری راستہ سے ہندوستان ہوکر آپ آزاد قبائل میں نہ پہنچیں آپ نے خشکی کے راستے سے سفر فرمانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن چونکہ ایران میں

انگریزی فوجیں اُس زمانہ میں پہنچی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے انور پاشا نے اس راستہ کو خطرناک قرار دیا اور طے یہ ہوا کہ اطراف بغداد سے بحری راستہ سے روانہ ہو کر مکران ہوتے ہوئے حضرت شیخ آزاد قبائل میں پہنچیں اور اپنے پہنچنے سے پہلے انور پاشا کا تحریر فرمودہ وثیقہ آزاد قبائل میں پہنچا دیں۔

اِس سفارت کے لئے مولانا ہادی حسن صاحب کو منتخب کیا گیا۔ اور ایک صندوق کی دیوار کے تختوں میں سوراخ کر کے وثیقہ کو اس میں رکھ دیا گیا۔ اور تختہ کو دونوں طرف سے ہموار کر دیا گیا۔

مولانا ہادی حسن صاحب بمبئی پہنچے تو نہایت سختی کے ساتھ ان کی تلاشی لی گئی۔ مگر کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ جب مکان پہنچے تو وثیقہ صندوق سے نکال لیا گیا اور وہ کپڑے جو اس بکس میں تھے دو کمرہ میں رکھ دیئے گئے۔ پولیس کو دوبارہ اُس وثیقہ کے متعلق کچھ اطلاعات پہنچیں۔ چنانچہ مکان پر چھاپہ مارا کپڑوں کے بکس کو خوب ٹٹولا اور توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ مگر نہ اب وہ بکس تھا اور نہ بکس میں وثیقہ تھا۔ بلکہ وثیقہ ایک واسکٹ کی جیب میں رکھ کر واسکٹ دالان میں سامنے کھونٹی پر ٹانگ دی گئی تھی جس کی طرف پولیس کا خیال بھی نہ گیا اور وثیقہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی جگہ پہنچا دیا گیا۔

سیدنا شیخ الہند قدس سرہ العزیز انور پاشا کے مشورے کے مطابق بحری راستہ سے سفر کا ارادہ فرما رہے تھے کہ حالات نے تبدیلی شروع کی۔ حضرت شیخ نے ارادہ فرمایا کہ غالب پاشا گورنر مکہ معظمہ سے ملاقات فرما کر استنبول پہنچیں اور اپنی اسکیم کو کامیاب کرنے کی صورت نکالیں۔ چنانچہ ۱۲ / ۱۳ / جمادی الثانیہ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء کو آپ اپنے رفقاء

کے ساتھ مکہ معظمہ روانہ ہوگئے۔

حضرت شیخ الہند کی مدینہ طیبہ سے روانگی

پہلے گذر چکا ہے کہ اپنے مقصد کی تکمیل کے شوق میں ۱۲ یا ۱۳ ر جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ کو حضرت شیخ الہند مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ پھر مکہ معظمہ پہنچکر ۲۰ ر رجب ۱۳۳۴ھ کو غالب پاشا سے ملاقات کرنے کیلئے آپ طائف تشریف لیگئے غالب پاشا سے ملاقات کے بعد آپ کا ارادہ استنبول تشریف لے جانے کا تھا۔ لیکن دشواری یہ ہوئی کہ شتربان ایک ہفتہ کی مہلت لیکر جا چکا تھا۔ کوئی اور سواری دستیاب نہ ہوئی۔ حضرت شیخ نے دو تین روز بعد دوبارہ تاکید فرمائی۔ مگر اب بھی سواری مہیا نہ ہو سکی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب سفرنامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

> ہم اُس وقت نہ سمجھ سکے کہ اس قدر تقاضا کیوں ہے۔ مگر دو تین روز بعد ہی معلوم ہوا کہ طائف دشمنوں کے محاصرہ میں ہے۔ گویا حضرت شیخ کی کشفی نگاہ نے ان واقعات کو دیکھ لیا تھا جن کو ہم نہ دیکھ سکتے تھے مگر چونکہ اخفار کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ نیز مقام رضا میں قدم راسخ تھا لہٰذا دو چار مرتبہ سواری تلاش کرنے کا تقاضہ کرکے خاموش ہوگئے

عربوں کو کس طرح باغی بنایا گیا

کرنل لارنس کی تمام تبلیغ شریف حسین اور سر ہنری میکموہن کے خفیہ معاہدیں کے باوجود غالباً عام باشندگان حجاز ترکوں سے بغاوت پر آمادہ نہیں تھے تو ان کو باغی بنانے کے لئے ایک نہایت وحشتناک اور انسانیت سوز طریقہ استعمال کیا اس کی تفصیل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی کے

الفاظ میں یہ ہے۔

(۱) غلہ ملک حجاز سے بند کر دیا گیا۔ اوائل ماہ صفر ۱۳۳۴ھ میں آخیر جہاز پہنچا اُس کے بعد غلہ کی آمد ملک حجاز سے بند کر دی گئی۔ جس کی وجہ سے سخت گرانی ہو گئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اہلِ ہند کے سخت مطالبہ پر ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ میں کلکتہ سے فیروزی آگ بوٹ چاول وغیرہ کے چند ہزار بورے لیکر روانہ ہوا۔ اس کو جبراً عدن میں خالی کرا دیا گیا اور وہ غلہ جدہ میں اُس وقت پہنچا جبکہ ٹرکی حکومت کا اثر بالکل اُٹھ گیا تھا۔

(۲) اُسی زمانہ میں بادبانی جہازوں کو جو بحر احمر میں افریقہ کے سواحل سے غلہ لاکر جدہ مکہ اور حجاز کے اہالی کو پہنچاتے تھے اور لوگوں کو بھوک سے مرنے کے محافظ ہوتے تھے۔ انگریزی جہازوں نے ڈبونا اور لوگوں کو قید کرنا اور غلہ چھیننا شروع کیا اور اسی طرح بہت سے بادبانی جہاز اہلِ عرب کے غارت کر دیے گئے جس کی وجہ سے غلہ کی آمد بالکل بند ہو گئی اور لوگ بہت زیادہ پریشان ہو گئے (صفحہ ۲۴ رسالہ ترکِ موالات)

(۳) دو برس سے زیادہ مدینہ منورہ محصور رکھا گیا۔ راستے بالکل بند کر دیئے گئے۔ ریل کی پٹری ڈائنامنٹ کے گولوں کے ذریعہ اُڑا دی گئی۔ غلہ بند کر دینے کی وجہ سے اس قدر شدت لوگوں پر ہوئی کہ ہزاروں آدمی بھوک سے مر گئے۔ قبروں سے مردوں کو نکال کر لوگوں نے ان کا گوشت کھایا اور طرح طرح کے ناگفتنی آلام اٹھانے پڑے (صفحہ ۲۴ رسالہ ترکِ موالات)

طائف پر باغیوں کا حملہ

پہلے گذر چکا ہے کہ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد حضرت شیخ جلد از جلد روانگی کا

ارادہ فرما رہے تھے مگر سواری مہیا نہ ہونے کے باعث چند روز طائف میں رُکنا پڑا۔ لیکن نیرنگیٔ زمانہ نے دوسرا گل کھلا دیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۱ شعبان ۱۳۳۴ھ کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے زیرِ کمان عبداللہ بیگ طائف پر چڑھائی کی لیکن شریف کی فوج میں عموماً غیر منظم بدو تھے۔ جن کو ترکی فوج کے معمولی دستے نے پسپا کر دیا۔

اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، ینبع، مدینہ منورہ میں بھی واقعہ پیش آچکا تھا کیونکہ شریف کا انتظام یہ تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ بغاوت ہو۔ جنگ چھڑ جانے سے آمد و رفت بند ہو گئی۔ میوے، غلے اور ترکاریاں سب بند ہو گئیں۔ شب و روز گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ترکوں کی مختصر سی جماعت شریف کی کثیر تعداد اور جدید سامان جنگ سے مسلح فوجوں کو تباہ کرتی رہی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی لیکن جب "جدہ" پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انگریزی کی مصری فوجیں مکہ معظمہ کے قلعے اور قشلہ کو توپوں سے فتح کرتے ہوئے طائف پہنچیں۔ اور طائف کے چاروں طرف توپیں نصب کر کے گولہ باری شروع کی گئی۔ رمضان المبارک کا سارا مہینہ اسی خوف و ہراس اضطراب اور بے چینی میں گذرا۔ خاص عید کے دن بھی انگریزوں اور شریف کی فوجوں نے مہلت نہیں دی۔ مسجد ابن عباس رضی اللہ عنہما جو طائف شریف کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اس میں بھی تراویح انتہ ترکیف سے ہوتی تھی اور کبھی کبھی گولیوں کی بوچھاڑ اتنی مہلت بھی نہ دیتی تھی لیکن اب طائف میں غلہ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ فاقوں سے تنگ آگئے تھے۔ مجبوراً ترکوں سے نجات کی درخواست کی۔ چنانچہ ان کو نکلنے کی اجازت دی گئی

۶ شوال ۱۳۳۴ھ کو حضرت شیخ بھی مع اپنے تینوں رفقاء کے طائف سے روانہ ہو کر ۱۰ شوال کو مکہ معظمہ پہنچے۔ آپ کا ارادہ یہی تھا کہ کسی صورت سے آپ استنبول پہنچ جائیں لیکن افسوس تقدیر تدبیر پر غالب آئی۔ آپ اسی مقصد سے جدہ تشریف لے گئے چونکہ مولانا خلیل احمد صاحب مکہؔ کی بدامنی کی وجہ سے مجبور ہو کر ہندوستان کیلئے روانہ ہو چکے تھے اور جہاز کی تلاش میں جدہ میں مقیم تھے تو حضرت شیخ کے اس سفر کا دوسرا مقصد مولانا سے ملاقات کرنا بھی تھا۔ بہرحال حضرت شیخ نے تقریباً دو ہفتہ جدہ قیام فرمایا۔ پھر مجبوراً مکہ واپس ہو گئے۔

اس سال ایک سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر مسمی بہاؤ الدین خاص طور پر مکہ[1] معظمہ بھیجا گیا۔ تاکہ حضرت شیخ کی نقل و حرکت کی تفتیش کرتا رہے۔

خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی اور ترکوں کی تکفیر کا فتوےٰ

شریف حسین کی بغاوت کے برخلاف جو بےچینی عام طور پر ہندوستان میں تھی اُس کو فرو کرنے کے لئے حکومت ہند نے تجویز کیا کہ خان بہادر صاحب موصوف کو خفیہ طور سے مکہ معظمہ بھیجکر ایک فتویٰ منگایا جائے۔ چنانچہ شریف کے عہدہ دار علماء

---

[1] مکہ معظمہ یعنی خداوند عالم کے حرم پاک میں جس بیرحمی اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا گیا اُسکی نظیر تاریخ میں ملنی دشوار ہے۔ گرمیوں کی شدت تھی۔ ترکوں نے روزے رکھ کر بے نظیر ہمت اور شجاعت سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ جب شکست کھا کر گرفتار ہوئے تو ان کی تمنا تھی کہ روزہ کی حالت میں وہ ذبح کیے جائیں مگر زبردستی اول اُن کے حلق میں پانی ڈالا گیا اور پھر ان کو حرم پاک میں ذبح کیا گیا۔

کی امداد سے خان بہادر صاحب نے استفتار اور اُس کا جواب مرتب کرایا ۔ جس میں ترکی قوم کی مطلقاً تکفیر تھی ۔ سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا اور شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا ۔ بہت سے شریفی علماء نے اُس پر دستخط بھی کر دیئے تھے ۔ لیکن علماء کی کثیر تعداد متردد اور خائف تھی ۔ حضرت شیخ کے سامنے یہ فتویٰ پیش کیا گیا تو حضرت موصوف نے سختی سے انکار فرما دیا ۔

آپ کے انکار پر تمام حق پرست علماء کی ہمت بلند ہو گئی ۔ جو حضرات متردد اور خائف تھے ۔ اُن سب نے دستخط سے اِنکار کر دیا ۔

گرفتاریاں

اس استفتار کا ایک مقصود یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے جذبات کو فرو کیا جائے ۔ مگر اہم مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کو اس بہانہ سے شریف سے طلب کیا جا سکے ۔

گورنمنٹ کی یہ چال کامیاب رہی ۔ شریف حسین اور اُس کے شیخ الاسلام اور بقیہ علماء وغیرہ کے دل میں حضرت شیخ کی جانب سے غبار پیدا ہو گیا کہ آپ ہم لوگوں کو باغی اور خارجی کہتے ہیں ۔

فتوے پر دستخط سے اِنکار کرنے کے بعد یقین ہو گیا تھا کہ شریف حسین اب کوئی الزام لگا کر گرفتار کرے گا ۔ یا انگریزوں کے حوالے کر دے گا ۔ چنانچہ ارادہ کیا تھا کہ شریف کی قلمرو سے باہر چلے جائیں ۔ مگر سواری وغیرہ میسر نہ آسکی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے ان حضرات کو شریف سے طلب کیا اور شریف نے گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے ۔

حضرت شیخ کی راحت کی خاطر حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے

شیخ الاسلام سے معافی بھی چاہی۔ مگر سب بے سود رہی۔

رفقاء حضرت شیخ نے اولاً طے کیا کہ حضرت شیخ اور مولانا وحید احمد صاحب کو کہیں چھپا دیا جائے۔ پھر خفیہ طور سے کہیں باہر بھیج دیا جائے گا۔ باقی اور حضرات کو اگر گرفتار بھی کیا گیا تو کچھ دنوں بعد چھوڑ دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اس پر عمل بھی کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کی گرفتاری

سب سے پہلے حضرت موصوف کو کوتوالی طلب کیا گیا اور انگریزوں کو برا کہنے کے جرم میں قید کر دیا گیا۔

حضرت شیخ الہند کے مقابلہ میں انگریزی تعلقات کو ترجیح

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے متعلق خبریں شہر میں گشت کرنے لگیں تو دہلی کے تاجر صاحبان شریف کے پاس پہنچے اور رحم کی درخواست کی مگر شریف نے جواب دیا کہ :-

"ہماری انگریز سے دوستی نئی ہے۔ ہمیں یہ دوستی قائم رکھنی ضروری ہے ہم نہیں چاہتے کہ اس میں رخنہ پیدا ہو"۔

حاضر کرو ورنہ گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے

۲۲ صفر دو شنبہ ۱۳۳۵ھ کو حضرت مولانا حسین احمد صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا وحید احمد صاحب چھپا دیئے گئے۔ مولانا عزیز گل صاحب مولانا حکیم نصرت حسین صاحب سامنے ہیں۔ ان دونوں سے حضرت شیخ کا پتہ دریافت کیا گیا۔ ان حضرات نے لاعلمی ظاہر کی تو گرفتار کر لیے گئے۔ شام تک پولیس نے سب جگہ حضرت شیخ کو تلاش کیا مگر ناکام رہی۔

گولی سے اڑا دو اور کوڑے لگواؤ

مغرب کے بعد شریف نے حکم دیا کہ اگر عشاء تک مولانا محمود الحسن صاحب حاضر نہ ہوں تو اُن کے دونوں رفیق (مولانا عزیر گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب) کو گولی سے اُڑا دو۔ اُن کے مطوف کی مطوفیت چھین لو۔ اور سَو کوڑے لگاؤ۔

حضرت شیخ الہند کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ "مجھے گوارا نہیں کہ میرے باعث میرے کسی دوست کا بال بیکا ہو۔"

چنانچہ عشاء کے قریب حضرت شیخ خود تشریف لے آئے۔ احباب نے اصرار کیا کہ احرام باندھ لیجئے تاکہ یہ کہا جاسکے کہ احرام باندھنے کے لئے حرم سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت کو فوراً زیر حراست لے لیا گیا۔ ساتھ اونٹوں پر سوار کرا کر مسلح گارد کی حفاظت میں جدہ روانہ کر دیا گیا۔ حضرت شیخ احباب سے ملاقات فرما رہے تھے اور ارشاد فرماتے تھے۔ "الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے"۔

مولانا حسین احمد صاحب چونکہ جیل خانہ میں تھے۔ آپ کو ان واقعات کا علم صبح کو ہوا جب احباب ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔

مولانا حسین احمد صاحب سے آپ کے احباب نے فرمایا کہ ہم نے آپ کی رہائی کی بہت کوشش کی مگر چونکہ شریف بہت خفا ہے۔ اس لئے کم از کم آٹھ دس روز آپ کو جیل میں رہنا پڑے گا۔

مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا میں مدینہ طیبہ سے حضرت مولانا کی خدمت کے لئے آیا ہوں اگر مولانا کو ہندوستان کے بجائے کہیں اور بھیجا گیا تو حضرت مولانا

کی حفاظت میں میرا رہنا نہایت ضروری ہے جس طرح ممکن ہو مجھ کو مولانا کے پاس بھجوا دیجئے۔ انھوں نے کہا یہ تو بہت آسان ہے۔ ہم ابھی شیخ الاسلام سے جا کر کہتے ہیں کہ "مادۂ فساد کا باقی رکھنا مناسب نہیں"۔ مولانا حسین احمد صاحب کو بھی مولانا محمود الحسن صاحب کے پاس ہی پہنچا دینا چاہیئے۔ چنانچہ ظہر کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا حسین احمد صاحب کو بھی جدہ کا حکم ہوا ہے اور پھر اگلے روز خچر پر سوار کرا کر جدہ روانہ کر دیا گیا۔

جدہ سے روانگی ان حضرات کو جدہ میں ایک ماہ قیام کرنا پڑا۔ کیونکہ "معتمد برطانیہ" کرنل ولسن کہیں باہر چلا گیا تھا۔ واپس ہوا تو حکم ہوا کہ ان حضرات کو مصر روانہ کر دیا جائے۔

چنانچہ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو خدیوی آگبوٹ پر سوار کرا کر مصر روانہ کر دیا گیا۔ ۲۲ ربیع الاول مطابق ۱۶ جنوری کو آگبوٹ سویز پر پہنچا۔ وہاں تقریباً ڈیڑھ درجن گوروں کی مسلح گارڈ کی حراست میں ان حضرات کو قاہرہ تک پہنچا دیا گیا۔ اور وہاں سے "جیزہ" جو قاہرہ کے مقابل دریائے نیل کی دوسری جانب واقع ہے، پہنچا دیا گیا۔ جہاں سیاسی جیل خانہ بنایا گیا تھا اس جیل خانہ میں تقریباً دو سو سیاسی قیدی مختلف ممالک کے اور بھی تھے جن میں بیشتر مسلمان تھے۔

اگلے روز صبح کو ان حضرات کو شہر میں لے گئے جہاں جنگی دفتر اور مرکز تھا۔ حضرت شیخ الہند کو ایک علیحدہ کمرے میں کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ جن میں تین انگریز موجود تھے جن میں دو انگریز نہایت صاف اردو بولتے اور سمجھتے تھے۔

ان کے پاس گورنمنٹ ہند کے بھیجے ہوئے کاغذات کا ایک فائل تھا جس میں سب حضرات کے متعلق رپورٹ تھی۔ حضرت شیخ الہند کی ڈائری بہت زیادہ تھی۔ اتفاق سے حضرت شیخ الہند کو کچھ پیشاب کا تقاضا بھی تھا۔ کچھ رفقار کی تنہائی کا خیال اور مزید براں انگریز سے طبعی نفرت۔ ان تمام چیزوں نے حضرت کے لب و لہجہ میں خاص طور پر سختی پیدا کر دی تھی۔ اس وقت بہت سے سوالات کیے گئے جن کے جوابات حضرت شیخ نے اُکھڑے طور پر نہایت بے التفاتی کے ساتھ دیئے ایک ہندوستانی کی یہ بے پروائی اور یہ طرزِ خطاب انگریز کی نظر میں حیرت ناک تھا۔ چنانچہ حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم سے شکایت بھی کی گئی کہ غالباً مولانا کو کبھی حکام سے سابقہ نہیں پڑا۔

ہم ذیل میں "سفر نامہ اسیر مالٹا"[1] سے ان سوالات اور جوابات کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ یہ سوالات اور جوابات بذاتِ خود حضرت شیخ الہند کی تاریخ ہیں مزید براں جوابات سے حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز کی ذہانت، ذکاوت، حاضر جوابی کے اندازہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ایک انقلابی عالم کس طرح اپنے دشمن کو احمق بنا سکتا ہے۔

سوال۔ آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا۔

جواب۔ اُس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر۔

---

[1] رولٹ ایکٹ کی رپورٹ میں حضرت شیخ الہند کو مذہبی مجنوں کہا گیا ہے آپ سوالات اور جوابات کا غور سے مطالعہ فرمائیے اور مجنون کے جنون اور عقل مندوں کی عقل نما حماقت کا اندازہ فرما لیجئے۔

سوال۔ آپ نے اس پر دستخط کیوں نہ کئے۔
جواب۔ خلاف شریعت تھا۔
سوال۔ آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ ہندوستان میں پیش کیا گیا۔
جواب۔ ہاں۔
سوال۔ پھر آپ نے کیا کیا۔
جواب۔ رد کر دیا۔
سوال۔ کیوں۔
جواب۔ خلافِ شرع تھا۔
سوال۔ آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں۔
جواب۔ ہاں۔
سوال۔ کہاں سے۔
جواب۔ انھوں نے دیوبند میں عرصہ دراز تک مجھ سے پڑھا ہے۔
سوال۔ وہ اب کہاں ہیں۔
جواب۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا[1]۔ میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں مقیم ہوں۔
سوال۔ ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے۔
جواب۔ مجھے کچھ علم نہیں نہ میں نے دیکھا ہے۔
سوال۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلافِ برطانیہ شریک ہیں

---

[1] کس قدر لطیف جواب ہے۔

اور آپ فوجی کمانڈار ہیں۔

جواب۔ اگر وہ لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ بھلا میں اور فوجی کمانداری میری جسمی حالت ملاحظہ فرمایئے۔ اور پھر عمر کا اندازہ کیجئے۔ میں نے تمام عمر مدرسی میں گذاری۔ مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا نسبت۔

سوال۔ مولوی عبید اللہ صاحب نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی۔

جواب۔ مدرسہ کے مفاد کے لیئے۔

سوال۔ پھر کیوں علیحدہ کیا گیا۔

جواب۔ آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

سوال۔ کیا اُس کا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی امر نہیں تھا۔

جواب۔ نہیں۔

سوال۔ غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے۔

جواب۔ غالب نامہ کیسا۔

سوال۔ غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا ہے اور آپ نے غالب پاشا سے اس کو حاصل کیا ہے۔

جواب۔ مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں وہ میرا رفیق سفر تھا۔ مدینہ منورہ سے وہ مجھ سے جدا ہوا ہے وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مدینہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھیرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے جس کو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں۔

سوال کرنیوالا۔ محمد میاں صاحب کے پاس حضرت شیخ۔ مولوی محمد میاں کہاں ہیں۔

سوال کنندہ ۔ وہ بھاگ کر حدودِ افغانستان میں چلا گیا ۔
مولانا ۔ پھر آپ کو خط کا پتہ کیوں کر چلا ۔
سوال کنندہ ۔ لوگوں نے دیکھا ۔ [1]
مولانا ۔ آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشا گورنرِ حجاز ۔ اور میں ایک معمولی آدمی میرا وہاں تک کہاں گذر ہوسکتا ہے پھر میں ناواقف شخص نہ زبانِ ترکی جانوں ۔ نہ پہلے سے ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط ۔ حج سے چند دن پہلے مکہ معظمہ پہنچا اپنے امور دینیہ میں مشغول ہوگیا ۔ غالب پاشا اگرچہ حجاز کا گورنر تھا ۔ مگر طائف میں رہتا تھا ۔ میری وہاں تک رسائی نہ حج کے پہلے ہو سکتی تھی نہ بعد از حج ۔ یہ بالکل غیر معقول بات ہے کسی نے یونہی اُڑائی ۔
سوال ۔ آپ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی ۔
جواب ۔ بے شک ۔
سوال ۔ کیوں کر ۔
جواب ۔ وہ مدینہ میں ایک دن کے لیے آئے تھے تو صبح کے وقت انھوں نے مسجد نبوی میں علمار کا مجمع کیا ۔ مجھ کو بھی مولوی حسین احمد صاحب اور وہاں کے مفتی اس مجمع عام میں لے گئے اور اختتام مجمع پر انھوں نے دونوں وزیروں سے مصافحہ کرا دیا ۔
سوال ۔ آپ نے اس مجمع میں کوئی تقریر کی ۔
جواب ۔ نہیں ۔
سوال ۔ مولانا خلیل احمد صاحب نے تقریر کی ۔ **جواب** ۔ نہیں ۔

---

[1] اصل سوال کو کس طرح ٹلا دیا گیا ۔

سوال۔ مولانا حسین احمد صاحب نے کی۔؟

جواب۔ ہاں۔

سوال۔ پھر کچھ انور پاشا نے آپ کو دیا۔

جواب۔ ہاں اتنا ہوا ہے کہ مولوی حسین احمد صاحب کے مکان پر ایک شخص پانچ پانچ پونڈ لے کر انور پاشا کی طرف سے آئے تھے۔

سوال۔ پھر آپ نے کیا کیا۔

جواب۔ مولوی حسین احمد صاحب کو دیدیئے تھے۔

سوال۔ ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطانِ ٹرکی۔ ایران اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں۔ اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں۔ اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔

جواب۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ کو بھی حکومت کرتے اتنے دن گذر چکے ہیں کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہنچ سکتی ہے اور کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرے جیسا شخص زائل کر سکتا ہے۔ اور پھر اگر زائل بھی ہو جائیں تو کیا ان میں ایسی طاقت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندوستان کی حدود پر فوجیں پہنچا دیں اور اگر پہنچا بھی دیں تو کیا ان میں آپ سے جنگ کی طاقت ہوگی[1]۔

سوال کرنیوالا۔ فرماتے تو آپ سچ ہیں مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے

---

[1] جواب خاص توجہ اور تحسین کا خواہاں ہے۔

سوال ۔ شریف کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے ۔

جواب ۔ وہ باغی ہے ۔

سوال ۔ حافظ احمد صاحب کو آپ جانتے ہیں ۔

جواب ۔ "خوب" وہ میرے اُستاذزادے ہیں اور بہت بڑے اور مخلص دوست ہیں ۔ میری تمام عمر اُن کے ساتھ گذری ہے ۔

اس قسم کے اور بھی سوالات کئے ، جن کے جوابات اسی نوعیت کے تھے ۔

اس کے بعد حضرت شیخ الہند کو رفقاء سے الگ ۔ اندرونِ جیل خانہ تنگ و تاریک کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا ۔ جس میں روشنی کے لئے پشت کی دیوار میں چھت کے قریب ایک روشن دان تھا ۔ کواڑ لکڑی کے تھے ۔ مگر اُن میں سوراخ نہیں تھا پاخانہ پیشاب وغیرہ کے لیے ایک بالٹی رکھ دی جاتی تھی ۔ اور ایک صراحی ۔

اگلے روز حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے اظہار ہوئے اور دو روز تک ہوتے رہے ۔ پھر مولانا عزیر گل صاحب ۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب ۔ مولانا وحید احمد صاحب مرحوم کے بیانات لئے گئے ۔

بیانات کے بعد ہر ایک کو کال کوٹھری میں بند کیا جاتا رہا ۔ ایک گھنٹہ کے لئے ان کوٹھریوں میں سے نکال کر باہر صحن میں ٹہلاتے تھے ۔ مگر یکے بعد دیگرے ۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک آپس میں ایک دوسرے کو خبر تک نہ ہوئی ۔ اس کے بعد ٹہلانے کا وقت ایک ہی کر دیا گیا جس کے باعث آپس میں ملاقات کر سکتے تھے اس عرصہ میں ہر ایک کو یقین ہو گیا تھا کہ پھانسی کا حکم ہوگا ۔

مگر بہ ظاہر ثبوت فراہم نہ ہو سکا لہٰذا پھانسی سے نجات ملی ۔ اور مالٹا جانے کا

حکم ہوا۔ چنانچہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا روانہ کر دیا گیا جو سیاسی اور جنگی قیدیوں کا مرکز تھا۔ اور جہاں صرف ایسے فوجی افسروں یا سیاسی اسیروں ہی کو بھیجا جاتا تھا جو بہت خطرناک اور اپنے خیالات پر نہایت سخت اور پختہ ہوتے تھے۔ اور کسی قسم کی طمع اُن پر کوئی اثر نہ کر سکتی تھی۔ ۲۹ ربیع الثانی مطابق ۲۱ فروری کو یہ حضرات مالٹا پہنچے۔ شام کے وقت ان کو اس لیے اتارا گیا کہ شہر والے دیکھیں اور خوش ہوں۔ کیونکہ وہ سب عیسائی تھے۔

مالٹا کے متعلق تفصیلی حالات تو سفرنامہ اسیر مالٹا میں ملاحظہ فرمائیں۔ ہم یہاں چند مضامین سفرنامہ سے نقل کرتے ہیں جن کو اس تحریر سے خاص مناسبت ہے۔

اسیران مالٹا۔ اُن کی باہم ہمدردی اور مشاغل

تمام اسیر تقریباً تین ہزار تھے جن میں تقریباً نصف جرمنی تھے اور باقی آسٹرین، بلغاری، ترکی، مصری، شامی وغیرہ تھے۔ چونکہ اس مجمع میں ہر قسم اور ہر لیاقت اور مختلف زبانوں کے لوگ جمع تھے اور کوئی کام اور خدمت کسی کے ذمہ نہ تھی اس لئے ترقی پسند لوگوں کو اس کی فکر لازم تھی کہ وہ اپنی عمر کا یہ حصہ ضائع نہ کریں۔ اس لئے عموماً لوگوں نے اپنے اوقات کو علوم کی تحصیل اور زبان کے سیکھنے میں صرف کیا۔ اس مجمع میں بڑے بڑے پروفیسر مختلف زبانوں اور فنون کے موجود تھے۔ ہر علم اور ہر زبان کی کتابیں یا تو وہیں مل جاتی تھیں ورنہ دیگر ممالک سے منگا لی جاتی تھیں۔

اس لئے یہ اسارت گاہ ایک حیثیت سے اچھا خاصا دارالعلوم بن گیا تھا خصوصاً سیاسی اُمور، تاریخی حالات اور بالخصوص سیاست حاضرہ کے لیے تو گویا

یہ جیل خانہ ایک بے نظیر کالج تھا۔ جس میں نہ صرف فکری سیاست کے جاننے والے تھے بلکہ عملی سیاست کے اعلیٰ ماہرین موجود تھے۔

پھر چونکہ یہاں پر سی۔ آئی۔ ڈی وغیرہ کے خطرات سے کامل اطمینان تھا۔ اس لیے ہر شخص آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر سکتا تھا۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ تمام قیدی اتحادی طاقتوں بالخصوص انگریزی گورنمنٹ اور انگریزی قوم کے دشمن تھے۔ علانیہ انگریزوں کو برا کہتے تھے انگریز یا ان کے کسی حلیف کی شکست کی خبر آتی تو خوشیاں منائی جاتیں جھنڈے اڑائے جاتے۔ اور اگر جرمنی ٹرکی وغیرہ میں سے کسی کی شکست کی خبر آتی تو سب کے سب غمگین نظر آتے۔ اگرچہ ان تین ہزار کے مجمع میں مسلمان، عیسائی، یہودی یعنی مختلف مذاہب کے لوگ تھے۔ رنگتیں مختلف، ممالک مختلف، مگر ایک دوسرے کے درد و غم میں سب شریک تھے اور مصیبتوں نے سب کو اتحاد کے ایک رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ ہر ایک دوسرے کا فدائی تھا۔ جاں نثار، اور دل سے ہمدرد، وہاں پر ایک عجیب منظر نظر آتا تھا۔ گویا مذہبی، قومی یا وطنی تفریق عالم انسانیت سے بالکل اٹھ گئی ہے۔ انسانیت کے رشتۂ اتحاد نے ایک دوسرے سے ایسا جکڑ دیا تھا کہ گویا ایک دوسرے کا حقیقی بھائی اور رشتہ دار ہے، ایک دوسرے کا خیال رکھتا اور جس کو کوئی تکلیف پہنچتی دوسرا اس کا ہمدرد ہوتا، انگریزی افسروں اور فوجیوں کو سب کے سب نہایت غصہ اور رنج کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے عموماً ہر قوم کے ذی علم اور مقتدر حضرات کو بہت زیادہ ہمدردی تھی اور بہت زیادہ تعظیم سے پیش آتے تھے۔ عید کے

ایام میں مسلمانوں کے علاوہ مقتدر جرمنی اور آسٹرین ملنے اور مبارکبادی کے لیے آتے اور گلدستے وغیرہ پیش کرتے۔ پرنس جرمنی جو قیصرِ جرمنی کا غالباً بھتیجا تھا۔ اور آئنڈن جہاز میں بحری کپتان فوج کے عہدہ پر تھا اور تمام قیدیوں میں شاہی خاندان کا ممبر ہونے کے سبب سے بہت بڑی عظمت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ عید کے روز حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ چند منٹ بیٹھتا اور چائے نوش کرتا اُس کے جواب میں حضرت شیخ الہند بھی دو چار مرتبہ اُس کے یہاں تشریف لے گئے۔ اگرچہ ملاقات نہایت مختصر فرمائی۔ جب کبھی راستہ میں مولانا کو دیکھ لیتا ٹوپی اتار کر سر جھکا کر سلام کرتا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی صداقت، حقانیت، تقویٰ اور طہارت نے احباب ہی کو نہیں مسخر کر لیا تھا۔ بلکہ دشمنوں کے دلوں پر بھی سکہ جما رکھا تھا۔ بڑے بڑے فوجی افسر، جرنیل، کرنیل اور میجر (باوجود انگریز ہونے کے اور اس بات کو سمجھنے کے کہ مولانا انگریزوں کی حکومت کو ہندوستان میں پسند نہیں فرماتے اور آزادیٔ ہند کے خواہاں اور خلافتِ اسلامیہ کے ہی خواہ ہیں) مولانا کے سامنے نہایت تعظیم سے پیش آتے تھے ٹوپی اُتار لیتے۔ حقیقت یہ ہے من کان للہ کان اللہ لہٗ (جو خدا کا ہو جاتا ہے خدا اُس کا ہو جاتا ہے) سفرنامہ اسیر مالٹا صفحہ ۶۶ و صفحہ ۶۷ و صفحہ ۶۸ و صفحہ ۶۸

مالٹا میں حضرت شیخ کے مشاغل جفاکشی اور استقامت

عمر میں سب سے بہتر فرصت تھی جو ایک عاشقِ خدا اور محبِ رسول کو میسر آئی۔ اس کا ایک ایک لمحہ غنیمت تھا۔ حضرت مولانا ہر ایک لمحہ کو یادِ خدا میں صرف کرتے۔ دن بھر میں سواً دس پارے پڑھ لیتے۔ تین چار ہزار بار اسم ذات کا ورد فرماتے۔ دلائل الخیرات

اور دیگر اذکار کا معمول پابندی سے جاری تھا، ترمذی شریف، مشکوٰۃ شریف اور جلالین شریف ہمراہ تھی۔ ان کا بھی مولوی وحید احمد صاحب مرحوم کو درس دیتے رہتے تھے۔ ترجمہ قرآن پاک کا مشغلہ بھی نہایت محبوب تھا۔

حضرت شیخ کو ہندوستان کی سردی بھی ستاتی تھی۔ سخت اذیت دیتی تھی۔ آپ سردی کے ایام میں ہمیشہ دن کو دھوپ میں سوتے تھے۔ بلکہ معمولی گرمیوں کے زمانہ میں بھی۔ سردیوں میں آگ اور کوئلے سے تاپنے کی اکثر عادت تھی۔ روئی کے کپڑے بہت استعمال فرمایا کرتے تھے۔ گھٹنوں میں اکثر درد رہا کرتا تھا۔ موسم سرما میں اکثر ہاتھوں اور پیروں پر ورم ہو جایا کرتا تھا۔ جو سینکنے سے دور ہو جاتا تھا۔ لیکن مالٹا کی شدید سردی میں شب بیداری کی عادت بدستور تھی۔ جبکہ نوجوانوں کو لحاف سے منھ نکالنا بھی دشوار معلوم ہوتا تھا۔ یہ شیخ وقت اور قطب عالم ۲/۱ بجے بیدار ہونا، استنجا کرنا، وضو کرنا، تہجد ادا کرنا، اور پھر چونکہ پیشاب کا عارضہ تھا۔ بار بار وضو کرنا پڑتا تھا۔ مگر کیا مجال کبھی سستی آسکے۔

باوجودیکہ ہر رفیقِ سفر خدمت کو سعادت سمجھتا تھا مگر تہجد کے وقت اس قدر آہستہ اُٹھتے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ نماز تہجد سے فراغت پا کر ذکر خفی، اور مراقبہ میں مشغول ہو جاتے۔ صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنے کے بعد اشراق کے وقت تک مصلے پر تشریف رکھتے۔ پھر قرآن شریف وغیرہ سے فراغت پاتے اور رات کے دس بجے تک، اسی قسم کے مشاغل میں مشغول رہتے (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سفر نامہ اسیر مالٹا)

مراعات کا حکم

غالباً ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ایک روز حضرت شیخ کو آفس میں بلایا گیا۔ کمانڈر نے کہا کہ ہمارے پاس خاص طور سے آپ کے متعلق یہ حکم آیا ہے کہ آپ کی پوری طرح خاطر داری کریں لہٰذا جو کپتان فوج کے حقوق اور مراعات ہوتے ہیں وہی آپ کے بھی ہوں گے۔ نیز آپ کو جن چیزوں کی شکایت ہو ان سے مطلع کریں۔ وغیرہ

چہ می فرمایند جاسوسانِ فرنگ

وقت ہے کہ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے متعلق اراکین رولٹ ایکٹ کمیٹی کی تحقیقات سے بھی ناظرین کو مطلع کر دیا جائے۔

اس رپورٹ میں ایک عنوان قائم کیا گیا ہے "ہندوستانی مذہبی مجنوں"[لہ] ان مجنونوں میں سب سے پہلے حضرت سید صاحب شہید کا تذکرہ کیا ہے اور وہی افترا اور بہتان دہرایا جو علماء اسلام کے متعلق اس قوم کی عادت ہے۔ لیڈرے تھے۔ عبد الوہاب سنجدی کے شاگرد تھے وغیرہ وغیرہ۔

سید صاحب کی تحریک کے مسخ شدہ تذکرہ کے بعد سر ولیم ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس آنجہانی کا قول۔ ان کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" سے نقل کیا ہے کہ

لہ یہ عجیب فلسفہ ہے کہ بمبئی کے مرہٹے اور بنگال کے انقلابی مذہبی مجنوں نہیں تھے۔ جنون کا الزام صرف ان حضرات پر لگایا گیا جن کو مسلمان اپنا پیشوا اور مقتدا مانتے ہیں۔ اور جنھوں نے نوع انسان کے نفع کے لئے خود کو قربان کیا؟ یہ ہے اس قوم کا تعصب جو دنیا کو متعصب کہتی ہے اور جس کے تقدس کی کہانیاں سرمایہ داروں کے ایوانوں اور اسٹیجوں پر آئے دن الاپی جاتی ہیں۔ کیا اس عنوان کا مقصود یہ نہیں کہ ایک طرف ہندوؤں کو اور دوسری جانب گریجویٹ مسلمانوں کو علمائے اسلام سے متنفر کیا جائے اور علماء ملت کی بے نظیر عظیم الشان خدمات کی آخری حد تک توہین اور تحقیر کی جائے۔

"اس میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اگر یہ ایکٹ (سازشی ایکٹ نمبر ۳) اس سازش میں استعمال کیا جاتا۔ جس کا نتیجہ ۱۸۸۵ء کی مہم اور اس کی تحقیقاتوں کی شکل میں نکلا تو برطانوی ہند کو ۱۸۶۳ء کی جنگ کی (وہابیوں کی جنگ کی) تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ اگر چند صحیح گرفتاریاں ہو جاتیں تو ہمارے ایک ہزار سپاہی درۂ مبیلا میں قتل و مجروح ہونے سے محفوظ رہتے اور لاکھوں پونڈ کا خرچ بچ جاتا۔

جنگ کے بعد بھی اگر اس سازش میں جو ۱۸۶۴ء کے سیاسی مقدمہ سے منکشف ہوئی۔ حکام انتظامی کے اختیارات کا سخت استعمال ہو جاتا تو اغلباً ہم ۱۸۶۸ء کی مہم "کوہ سیاہ" سے محفوظ رہتے"۔

غرض اسی قسم کے دیگر واقعات پر اظہار افسوس کرنے کے بعد رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان تحریر فرماتے ہیں۔

ریشمی خطوط والی سازش

اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں ریشمی خطوط کی سازش کہلاتی ہے۔

یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ:۔ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اسکو تقویت دینے کے لیے ایک شخص مولوی عُبیداللہ اپنے تین رفقاء فتح محمد اور محمد علی کو ساتھ لیکر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عُبیداللہ سکھ سے مسلمان

ہوا ہے اور صوبجات متحدہ کے ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی تھی۔ وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسہ کے خاص لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا۔ اور سب سے بڑا شخص جس نے اس پر اثر ڈالا وہ مولانا[1] محمود الحسن تھا۔ جو سکول میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے۔ عُبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلا دے لیکن اس کی تجاویز کے راستہ میں مدرسہ کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سدراہ ہوئے۔ انہوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔

اس امر کا بھی ثبوت مل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مصیبت میں گرفتار رہا۔ پھر بھی وہ مولانا محمود الحسن کے پاس عام طور پر آتا رہا۔ مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے ہوتے رہے۔ اور اس امر کی اطلاع[2] ملی ہے کہ سرحد سے کچھ آدمی بھی وہاں آتے تھے۔

---

[1] یہ ہے لطیفۂ قدرت۔ تحقیق کنندگان کے ذہن میں آیا کہ مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ اسکے بانی ہنیں ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس وقت نجات پاکر ہندوستان واپس تشریف لے آئے جب آپکی ہندوستان میں شدید ترین ضرورت تھی اور جمعیۃ علمار ہند میں روح ڈال کر آپ نے علمار ہند کو سیاست کی اس اونچی سطح پر پہنچا دیا جس پر آج غیر علمار رشک کر رہے ہیں۔ ۱۲۔

[2] یہ اطلاع دینے والے اغلباً وہی انمیں احمد صاحب ہیں جو علی گڈھ کالج سے عربی کی تعلیم کے لئے دیوبند گئے تھے اور حضرت شیخ الہند کے ساتھ انتہائی عقیدت کا اظہار کیا کرتے تھے (بقیہ صفحہ ۱۶۶ پر)

۸ استمبر ۱۹۱۵ء کو محمود حسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور دوستوں کے ساتھ عبید اللہ کی مثال کی پیروی کی اور شمال کی طرف جانے کے لئے نہیں بلکہ عرب کے صوبہ حجاز میں مقیم ہونے کے لئے ہندوستان چھوڑ دیا۔

روانہ ہونے سے پہلے عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرض اشاعت میں لایا جن میں ہندوستانی مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی تھی اور ان کو جہاد کے فرض اولیٰ کے ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں مولانا محمود الحسن صاحب بھی شامل ہیں۔ عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت زبردست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت سے اس کو تقویت پہنچے۔ اب ہم ذیل میں اُن کوششوں کا ذکر کریں گے جو ان لوگوں نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لئے کیں۔

عُبید اللہ اور اس کے دوست پہلے ہندوستانی مجنونان مذہبی کے پاس گئے اور اس کے بعد کابل پہنچے۔ وہاں وہ ترکی جرمنی کے ممبروں سے ملے اور ان سے تبادلۂ خیالات کیا۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آن ملا۔ یہ آدمی مولانا محمود الحسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں وہ اعلان جہاد ساتھ لے کر آیا۔ جو حجاز کے ترکی فوجی حاکم "غالب پاشا" نے مولانا محمود الحسن کو دیا تھا۔ اثنا راہ میں "محمد میاں" اس تحریر (جو غالب نامہ سے مشہور ہے)

(بقیہ از صفحہ ۱۶۵) مگر اصل راز پر مطلع نہ ہو سکے یہ بھی سنا گیا ہے کہ خفیہ مجالس تہہ خانوں میں ہوتی تھیں انمیں احراری تک نہ پہنچ سکے تو صرف ایسے حضرات کے فوٹو بھیجنے پر قناعت کی۔

کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی قوموں میں تقسیم کرتا ہوا آیا۔

عُبید اللہ اور اُس کے ساتھی سازشی لوگوں نے ایک تجویز تیار کی تھی۔ کہ جب سلطنت کو مٹایا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔ ایک شخص مہندرا پرتاب اس کا پریذیڈنٹ ہونے والا تھا۔ یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو اور خود رائے وہمی سیرت کا آدمی ہے اور ۱۹۱۴ء میں اُسے اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں سفر کرنے کا پروانہ راہ داری دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا جنیوا کو گیا۔ وہاں ہردیال سے ملا اور ہردیال نے اس کا جرمن قونصل سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد وہ جرمن چلا گیا

ایک شخص جو عبید اللہ کو اچھی طرح جانتا ہے اُس کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ وہ شخص تجویزیں تیار کرنے میں بہت عجیب و غریب اور غیر معمولی آدمی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی سلطنت کا حکمران ہے۔ مگر جہاں کام کرنے کا وقت آجائے وہ بہت سست تھا اور کام کرنے سے جی چُراتا تھا۔

وہ وہاں سے کسی خاص مشن کے لیے بھیجدیا گیا۔ کیونکہ اُس نے جرمنوں پر اپنی اہمیت کا اثر مبالغہ آمیز طریقہ پر ڈالا تھا۔

خود عُبید اللہ ہندوستان کا وزیر ہونے والا تھا اور کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر برکت اللہ۔ جس نے برلن کے راستہ کابل کا سفر کیا تھا۔ وزیر اعظم ہونے والا تھا۔ یہ شخص ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا بیٹا تھا۔ اور انگلستان، امریکہ اور جاپان ہو آیا تھا۔ یہ شخص ٹوکیو میں ہندوستانی کا پروفیسر مقرر ہوا تھا اور وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف ایک نہایت تیز اخبار "اسلامک فریٹرنٹی"

کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس اخبار کو بعد میں جاپانی حکام نے بند کردیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے عہدہ سے موقوف کردیا گیا اور پھر امریکہ جاکر وہ اپنے غدری دوستوں میں مل گیا۔

وہ جرمن جو افغانستان میں اپنے مقاصد کے لیے آئے تھے جب ناکام رہے تو ۱۹۱۶ء میں واپس چلے گئے مگر ہندوستانی وہیں رہے۔ اور حکومت عارضی والوں نے روسی ترکستان کے حاکم اور زار روس کو اس مضمون کے خط لکھے کہ روس کو چاہئے کہ برطانیہ کلاں کے اتحاد کو خیرباد کہہ کر ہندوستان سے سلطنت برطانیہ کے مٹا دینے کی کوشش میں امداد کرے۔ ان خطوط پر مہندر پرتاب کے دستخط تھے۔ آخر وہ برطانیہ کے ہاتھ آگئے۔

شہنشاہ روس کے نام جو خط تھا وہ سونے کے پتر پر لکھا گیا تھا جس کی عکسی تصویر ہمیں دکھائی گئی ہے۔

"حکومت عارضی" نے ترکی گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز بھی کی۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے عبیداللہ نے اپنے پرانے دوست محمود الحسن صاحب کو خط لکھا۔ یہ خط اور ایک خط مورخہ ۸ رمضان مطابق ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کے ساتھ جو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا بند کرکے اس نے حیدرآباد سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے نام ایک نوٹ لکھ کر بھیج دیا۔ یہ شخص اس وقت مفقود الخبر ہے۔ شیخ عبدالرحیم سے اس نوٹ میں یہ التجا کی تھی کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ وہ خطوط مکہ میں مولانا محمود الحسن صاحب کو پہنچا دے۔ وہ خطوط زرد ریشمی کپڑے پر بہت صاف اور خوشخط لکھے ہوئے ہیں۔

محمد میاں کے خط میں یہ باتیں لکھی تھیں۔

جرمن اور ترک وفد کا آنا۔ جرمنوں کا واپس جانا۔ ترکوں کا بغیر کسی کام کے رہ جانا۔ غالب نامہ کی اشاعت۔ حکومت کی تجویز۔ خدائی فوج کی مجوزہ ساخت۔[لہ]

اس فوج کے لیے یہ تجویز تھی کہ اس کے لئے ہندوستان سے رنگروٹ بھرتی کیے جائیں اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔ محمود حسن ان تمام معاملات کو حکومت عثمان تک پہنچانے پر مقرر کیا گیا تھا۔ عبیداللہ کے خط میں خدائی فوج کا ایک نقشہ تھا۔

اس فوج کا ہیڈ کوارٹر مدینہ اور اس کا جنرل انچیف محمود حسن ہونے والا تھا دوسرے ہیڈ کوارٹر مقامی جرنیلوں کے ماتحت قسطنطنیہ۔ طہران اور کابل میں قائم ہونے والے تھے۔

کابل میں خود عبیداللہ جرنیل مقرر ہونے والا تھا۔

اس نقشہ میں تین سرپرستوں ۱۲ فیلڈ مارشلوں اور بہت سے اعلیٰ فوجی افسروں کے نام تھے۔ لاہور کے بھاگے ہوئے طالب علموں میں سے ایک میجر جرنیل اور کرنیل اور چھ لفٹنٹ کرنیل ہونے والے تھے۔ جو اشخاص ان اعلیٰ عہدوں کے لئے منتخب کئے گئے ان میں سے اکثر ایسے تھے جن سے ان کے تقرر کی نسبت مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔

لیکن ریشمی خطوط سے جو اطلاعات ملیں، ان میں بعض تدارک ضروری

لہ کیا خدائی خدمت گار اسی تجویز کا عملی نمونہ ہے۔

تھے۔ وہ کئے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور ان کے چار رفقا ربرطانیہ کے ہاتھ آگئے وہ اس وقت جنگی قیدی ہیں اور برطانیہ کی سلطنت کے ایک حصہ میں نظر بند ہیں۔

غالب نامہ کی تشریح غالب پاشا بھی جس نے غالب نامہ پر دستخط کئے تھے جو آج کل جنگی قیدی ہے اور وہ اس امر کا اقبال کرتا ہے کہ اس نے کاغذ پر دستخط کئے تھے جو محمود حسن پارٹی نے اس کے روبرو پیش کیا تھا۔ اُس کے ضروری حصہ کا ترجمہ یہ ہے۔

ایشیا۔ یورپ۔ اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کی راہ میں جہاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں خدائے قادر وقیوم کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین دشمنانِ اسلام پر غالب آگئے ہیں اس لیئے اے مسلمانو اس ظالم عیسائی حکومت پر حملہ کر دو جس کی قید میں تم پڑے ہو۔

بہت جلد عزم صمیم سے اپنی تمام کوششوں کو دشمن کے مار ڈالنے کے لئے وقف کر دو اور ان سے نفرت اور دشمنی ظاہر کر دو۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مولوی محمود حسن آفندی جو پہلے ہندوستان کے مدرسہ دیوبند میں تھے ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے مشورہ لیا ہم نے اِس خیال میں ان کی تائید کی اور انھیں ضروری ہدایات دیدی ہیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان پر اعتماد کرو۔ اور آدمیوں۔ روپے اور ہر چیز سے جو وہ طلب کریں ان کی امداد کرو۔

رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح علم نہ ہو سکا۔ تاہم گذشتہ تحریر سے حضرت شیخ کی جلالت و عظمت اور آپ کی تجویز کا کافی اندازہ ہو گیا۔

نتیجہ حضرت شیخ کی تجویز بلا شبہ کامیاب تھی مگر افسوس عربوں کی بغاوت اور جرمنی کی اچانک شکست نے اس کو ناکام کر دیا۔ اسی کا اثر تھا کہ حضرت شیخ قدس سرہ کو عربوں سے سخت کبیدگی اور نفرت ہو گئی تھی۔

جب ہندوستان تشریف لائے تو مراد آباد میں حضرت شیخ کو مدعو کیا گیا۔ استقبال کے لئے اسٹیشن پر مراد آباد اور اطراف کے والنٹیروں کا بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ ان میں سیوہارہ کے والنٹیر عربی طرز کا عبا پہنے ہوئے اور عقال باندھے ہوئے تھے۔

حضرت شیخ تشریف لائے ان دیسی عربوں کی وردی کو دیکھا تو ارشاد فرمایا۔

یہ غداروں کا لباس ہے اس کو اتار دو۔

اسارت مالٹا کا زمانہ اور ہندوستان

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مالٹا سے واپسی پر جو خدمت انجام دی یا تحریک کی بنیاد جس صورت سے رکھی۔ اس کو بیان کرنے سے پیشتر ضرورت ہے کہ ان حالات کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو اس عرصہ میں پیش آئے اور جنھوں نے ہندوستان کی سیاست میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو جنگِ جرمنی کا اعلان ہوا۔ اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو[1] اس کے التوا کا، پہلے گذر چکا ہے کہ ۱۹۱۵ء کے فروری میں ایک دن مقرر کیا گیا۔ جس میں تمام انگریزوں کو قتل کر ڈالنے کی اسکیم تھی۔ مگر اسلحہ فراہم نہ ہو سکنے کے باعث یہ تجویز فیل ہو گئی۔

بہر حال ۱۹۱۵ء تک انقلابی جدوجہد تشدد اور بیرونی ممالک سے سازش کے اصول پر چلتی رہی۔ مگر ۱۹۱۶ء میں انگریزی حکومت نے اس اسکیم پر بڑی حد تک قابو پا لیا۔ ایک قانون نافذ کیا گیا۔ جس کا نام "قانون تحفظ ہند" تھا اور پھر اس قانون کی آڑ میں ہزاروں نفوس کو جیل خانہ میں بھر دیا گیا اور سینکڑوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

---

[1] ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو دن کے گیارہ بجے پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی۔

پھانسیوں پر لٹکنے والے یا سزایاب ہونے والے تمام ہندوستان کے جانباز انقلابی مجاہدین کی صحیح تعداد بیان کرنی مشکل ہے۔ صرف صوبہ پنجاب کے متعلق سرکاری رپورٹ ہے کہ ۲۰۸ آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ ایک سو کالے پانی بھیجے گئے اور چار ہزار کے قریب گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے۔ (ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ صفحہ ۳)

کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد

مسلم لیگ کے متعلق اگرچہ علامہ شبلی نے فرمایا تھا کہ لیگ کا سنگ بنیاد شملہ ڈیپوٹیشن تھا۔ اور اب یا آئندہ جو کچھ اس کا نظام بنایا جائے گا۔ شملہ ڈیپوٹیشن کی روح اس میں

شملہ ڈیپوٹیشن کا پس منظر

تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے لیے جو طریقہ کار تجویز کیا گیا اس کا اندازہ "سر جان سیلکم" کے مندرجہ ذیل قول سے ہوتا ہے۔

"اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں، اُن کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جُدا رہیں گے اُس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اُٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی (عہد کمپنی کی تاریخ تعلیم انگریزی از میجر باسو)

اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام تاریخوں کا مسخ کر دینا تھا۔ جس کو سر ہنری ایلیٹ

موجود رہے گی۔ لیگ کی بنیاد کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی ہے۔ اس پر جو عمارت بنائی جائے گی۔ ٹیڑھی ہو گی۔ لیگ کی پالٹیکس صرف یہ ہے

نے انجام دیا جس کا تذکرہ سابق اوراق میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

اپریل ۱۹۰۰ء میں ایک دوسرا شگوفہ چھوڑا گیا۔ وہ یہ کہ سر اینٹونی میکڈانل لفٹنٹ گورنر صوبہ یو۔پی نے ایک گشتی حکم اس مضمون کا جاری کرایا کہ عدالتوں اور کچہریوں میں ہندی حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں لی جا سکیں گی۔ اس حکم پر ہندوؤں کی طرف سے گورنمنٹ کے شکریہ کے جلسے اور مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ سے اظہار ناراضگی کے جلسے منعقد ہونے لگے۔ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو کی طرف یہ دوسرا بنیادی قدم تھا۔

یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ہندی اور اردو اس ملک کی پیداوار ہیں۔ ان پر بحث وہ کرتے ہیں جو آٹھ ہزار میل کی زبان انگریزی کے مفتون اور فریفتہ ہیں اور قائداعظم محمد علی جناح جیسے بزرگ تو اردو لکھ اور بول بھی نہیں سکتے۔ بہر حال اس پائیدار تخم پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ تقسیم بنگالہ کا تیسرا شوشہ چھوڑ کر ہندو اور مسلمانوں کی باہمی آویزش کو اور بھی ہوا دی جانے لگی۔ تاہم معاملہ صرف صوبہ بنگال کا تھا پورے ہندوستان میں ہندو مسلم چپقلش کے لئے ایک شوشہ چھوڑا گیا اور یہ عین اس وقت کہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگالہ کا اعلان کر کے مادۂ نفرت کو پختہ کر دیا گیا تھا۔ شملہ ڈیپوٹیشن اس نئے شوشے کی اجمالی تعبیر ہے۔

شملہ ڈیپوٹیشن کی تشریح

ایک طرف تقسیم بنگال کے اعلان کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو دوسری طرف گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانیوں کو کونسلوں میں حقوق دینے کے سامان کیے جا رہے تھے۔

کہ جو ملکی حقوق اور عہدے ہندوؤں نے حاصل کئے ہیں۔ اُن میں مسلمانوں کا حصہ مُعیّن

جان مارلے وزیر ہند کی بجٹ اسپیچ کی بنا پر لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے جو لارڈ کرزن کے بعد تشریف لائے کونسل کی توسیع کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۰۶ء کو نواب حاجی محمد اسماعیل خاں رئیس علی گڑھ نے جو نینی تال میں تھے اور حکام رس تھے۔ نواب محسن الملک بہادر آنریری سکریٹری کالج کو ایک مسودہ تیار کر کے بھیجا کہ مسلمان بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔

اس زمانہ میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل "مسٹر ارچبولڈ" بوجہ تعطیلات کلاں شملہ میں تھے جو وہاں اعلیٰ حکام سے ملتے رہتے تھے۔ انہوں نے مجوزہ وفد کے بارے میں وائسرائے کے پرائیویٹ سکرٹری سے گفتگو کی۔ اس گفتگو کے بعد مسٹر ارچبولڈ نے جو چٹھی ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک مرحوم کو لکھی اور جو طبع ہو کر ممبران وفد کے پاس بھیجی گئی۔ اس چٹھی کے خلاصہ سے جو ذیل میں درج ہے معلوم ہو جائے گا کہ علی گڑھ کا یہ کالج جس کو مسلمان مرکز العلوم اور دار العلوم سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کس طرح وہ انگریزی سیاست کا مرکز اور اس کی ڈپلومیسی کا آلہ کار رہا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا چٹھی کا خلاصہ یہ ہے جس کا ایک ایک لفظ توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔

کرنل ونلاپ اسمتھ پرائیویٹ سکرٹری وائسرائے اب مجھے لکھتے ہیں کہ حضور وائسرائے مسلمانوں کا وفد منظور کرنے کو تیار ہیں اور مجھے ہدایت کرتے ہیں کہ اس کے لئے ایک باقاعدہ درخواست بھیجی جائے۔ اس کے متعلق حسب ذیل امور غور طلب ہیں۔ اول درخواست بھیجنے کا مسئلہ ہے میرے نزدیک یہ کافی ہوگا کہ مسلمانوں کے کچھ نمائندے اگرچہ ان کا انتخاب نہ ہوا

کر دیا جائے۔ یہ حقیقی پالٹیکس نہیں ہے۔ حقیقی پالٹیکس گورنمنٹ سے رعایا کے مطالبہ کا

ہو درخواست پر دستخط کر دیں۔ دوسرا مسئلہ ممبران وفد کا ہے۔ یہ لوگ جملہ صوبجات کے نمائندے ہوں۔ تیسرا مسئلہ ایڈریس کے مضمون کا ہے اس کی نسبت یہ ہے کہ ایڈریس میں وفاداری کا اظہار کیا جائے۔ اس امر کا شکریہ ادا کیا جائے کہ طے شدہ پالیسی کے مطابق حکومت خود اختیاری کی طرف قدم بڑھایا جانیوالا ہے جس کی رو سے ہندوستانیوں کے لئے عہدے ملنے کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ مگر اس اندیشہ کا اظہار کیا جائے کہ طریقۂ انتخاب جاری کرنے سے مسلمان اقلیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ امید ظاہر کی جائے کہ نامزدگی کا طریقہ جاری کرنے میں یا مذہبی عقائد کی نیابت دینے میں مسلمانوں کی رائے کو مناسب اہمیت دی جائیگی اس رائے کا اظہار کیا جائے کہ ہندوستان جیسے ملک میں یہ ضروری ہے کہ زمینداروں کی رائے کو اہمیت دی جائے۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی سب سے زیادہ عقلمندی اس میں ہو گی کہ وہ نامزدگی کے طریقہ کی تائید کریں۔ کیونکہ ابھی انتخاب کا وقت نہیں آیا۔ علاوہ بریں ان کے لئے نہایت مشکل ہو گا کہ طریقۂ انتخاب جاری ہونے میں انھیں مناسب حصہ مل سکے مگر میں اس تمام کارروائی میں پردے کے پیچھے رہنا چاہتا ہوں اور یہ تحریک تمہاری طرف سے ہونی چاہئیے مگر آپ واقف ہیں کہ میں مسلمانوں کے فوائد کا کس قدر دل سے خواہاں ہوں اور اس لئے میں نہایت خوشی کے ساتھ ہر قسم کی امداد کروں گا۔ میں تمہارے لئے ایڈریس تیار کرانے یا اس پر تنقید کرنے کا کام کر سکتا ہوں۔ اگر وہ بمبئی میں تیار کرایا جائے تو میں اس کا مسودہ دیکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے عمدہ الفاظ میں استدعا کرنے کا فن آتا ہے۔ مگر نواب صاحب یہ یاد رکھئے کہ اگر تھوڑے وقت میں

نام ہے۔ اور اس جذبہ میں مذہب کی برابر قوت ہے۔ اسی قوت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کا ممبر کسی قسم کا نقصان اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا اور اپنے میں کوئی عزم اور دلیری نہیں پاتا۔ ؎

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۶) کوئی با اثر اور زبردست تحریک پیدا کرتی ہے تو ہمیں فی الواقع بہت جلدی کرنی چاہیئے۔"

چنانچہ یہ ایڈریس حسب ہدایت بہت جلد مرتب کیا گیا اور اس میں ظاہر کیا گیا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ سے اپنے حکام پر بھروسہ رہا ہے اور انھوں نے حقوق کو طلب کرنے میں حکام کو پریشان کرنے سے احتراز کیا ہے۔ نیز کہا گیا کہ یورپ کے نمونہ کی نیابتی جماعتیں ہندوستانیوں کے لئے نئی ہیں۔ اس لیئے ان کے اختیار کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ ہمارے قومی مفاد کی باتیں ایک غیر ہمدرد اکثریت کے رحم پر منحصر ہو جائیں گی۔ (روشن مستقبل صـ ۳۴۷، صـ ۳۴۸)

؎ علامہ موصوف کی پوری عبارت حسب ذیل ہے۔

لیگ کا سنگ اولین شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا اور اب یا آیندہ جو کچھ اس کا نظام ترکیبی قرار دیا جائے ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہیگی ڈیپوٹیشن کا مقصد سر تا پا یہ تھا اور یہ ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے (اپنی ۲۰ سالہ جد و جہد سے) حاصل کئے ہیں اُن میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے۔ آج مسلم لیگ کو

لیکن ۱۹۱۰ء سے کچھ حالات ایسے پیدا ہوتے رہے کہ مسلم لیگ حقیقی سیاست کی طرف قدم بڑھاتی رہی حتیٰ کہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس کے ساتھ مندرجہ ذیل سمجھوتہ ہو گیا۔ جو میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء کے نام سے مشہور ہے۔

اپنی شرم مٹانے کے لئے کبھی کبھی عام ملکی مقاصد میں سے بھی کسی چیز کو اپنی کارروائی میں داخل کر لیتی ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اس کے چہرہ کا مستعار غازہ ہے۔ رات دن جو شور مچایا جاتا ہے۔ روزمرہ جس عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے جو جذبہ ہمیشہ ابھارا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو ہم کو دبائے لیتے ہیں اس لئے ہم کو اپنا تحفظ کرنا چاہئے۔ مسلم لیگ کا اصلی عنصر صرف یہ ہے باقی جو کچھ ہے موقع اور محل کی خصوصیات کے لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے۔ ہم شملہ ڈیپوٹیشن کی عظمت اور اہمیت کے منکر نہیں۔ یہ سب سے بڑا تماشا تھا جو قومی اسٹیج پر کیا گیا۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ کبار رعایا میں سے دونوں کی باہمی نزاع اور چارہ جوئی کا نام پالٹیکس ہے۔ اگر یہ پالٹیکس ہے تو سرکاری عدالتوں میں ہر روز جو کچھ ہوتا ہے وہ سب پالٹیکس ہے۔ اور ہائیکورٹ کو ہائیکورٹ نہیں بلکہ سیاستگاہ اعظم کہنا زیادہ موزوں ہوگا جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصہ میں لکھ آئے ہیں۔ پالٹیکس کا خط وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ انتظام حکومت میں رعایا کی شرکت کس حد تک ہونی چاہئے۔ یعنی پالٹیکس گورنمنٹ اور رعایا کے

بقیہ حاشیہ صد ۱۶۹ پر)

میثاقِ لکھنؤ[1] صوبائی کونسلوں کے متعلق طے ہوا کہ بڑے صوبوں میں ۱۲۵ ممبروں کی ہوں۔ اور چھوٹے صوبوں میں ۵۰ سے ۷۵ کی ہوں ۴/۵ حصہ ممبروں کا انتخاب کے ذریعہ ہو۔ حق رائے دہندگی میں توسیع ہو۔ ہر اقلیت کے انتخاب کے لیے معقول انتظام ہو۔

مسلمانوں کے لئے نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعہ ہو۔ جس کی صوبوار تفصیل یہ تھی

نام صوبہ	فیصدی آبادی[2]	کونسل میں مسلمان ممبروں کی فیصدی تعداد
پنجاب	۵۵	۵۰
بنگال	۵۳	۴۰

(صفحہ ۱۷۸ کا بقیہ حاشیہ) باہمی مطالبہ جات کا نام ہے۔ نہ رعایا کے باہمی تنازعات اور حقوق طلبی کا۔ آخر میں فرماتے ہیں "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر ہماری پالٹیکس دراصل پالٹیکس ہوتی تو جد و جہد اور ایثار اور خود فروشی کے جذبات خود بخود ساتھ پیدا ہو جاتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی جاتی ہے تو تا ثریا مے رود دیوار کج کا مصداق ہوتا ہے۔

[1] ماخوذ از تاریخ مسلم لیگ مصنفہ مرزا اختر حسن صاحب بی۔اے۔ مطبوعہ مکتبہ لیگ بمبئی ۳ مرزا صاحب فرماتے ہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور مسلم لیگ ریفارم کمیٹی کے مشترکہ فیصلہ کی کارروائی ۱۷ اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۶ء بمقام کلکتہ ہوئی اس جلسہ کی صدارت سر سریندر ناتھ بنرجی نے فرمائی تھی۔ کانگریس کمیٹی کے نمائندوں کی تعداد ۵۲ تھی اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی تعداد ۲۰ تھی۔ صفحہ ۱۲۷

[2] میثاق لکھنؤ کی تمام دفعات تاریخ مسلم لیگ مصنفہ مرزا اختر حسن صاحب بی۔اے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰ پر)

نام صوبہ	فیصدی آبادی	کونسل میں مسلمان ممبروں کی فیصدی تعداد
یو پی	۱۴	۳۰
بمبئی و (سندھ)	۲۰	۳۳
بہار و اڑیسہ	۱۰	۲۵
صوبہ متوسط (سی پی)	۴	۱۵
مدراس	۷	۱۵

(بقیہ حاشیہ ۱۷۹) سے ماخوذ ہیں صرف فیصدی تعداد روشن مستقبل سے ماخوذ ہے۔

یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ میثاق لکھنؤ مسٹر جناح کی زیر قیادت ہوا کیونکہ اس وقت مسٹر جناح لیگ کے پریذیڈنٹ تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب مالٹا میں اسیر تھے۔ مولانا محمد علی مرحوم مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے قوم پرور رہنما نظر بند یا اسیر تھے۔ ان سب حضرات کو اس میثاق پر افسوس ہوا کیونکہ اس میثاق میں اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کی تو کچھ رعایت ہوئی کہ مردم شماری سے کچھ زائد نشستیں ان کو مل گئیں مگر اکثریت والے صوبوں کے مسلمانوں کا گلا گھونٹ دیا گیا اقلیت والے صوبوں کو جو رعایت ملی وہ مسلم مفاد کے لحاظ سے واقعی بے سود تھی کیونکہ زیادہ سے زیادہ سیٹیں صوبہ بمبئی اور سندھ کو ملیں اس صوبہ کے مسلمانوں کو ۳۳ فیصدی نشستیں دی گئیں۔ مگر ہندو اکثریت کے مقابلہ میں یہ آخری رعایت بھی بے سود تھی۔ اس رعایت میں صرف اُن چند مسلمانوں کا فائدہ تھا جو ممبری کے حریص تھے۔ کہ اگر تعداد آبادی کے لحاظ سے ممبریاں ملتیں تو صرف بیس مسلمان ممبر ملتے اب ۱۳ اور بن سکتے تھے عام مسلمانوں کو کچھ بھی فائدہ نہ تھا

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۱ پر)

مرکزی کونسل کے متعلق طے کیا گیا کہ اس میں ایک تہائی تعداد مسلمان ممبروں کی ہوگی اور صوبہ وار تعداد ممبروں کی اُسی تناسب سے ہوگی جیسے صوبائی کونسل میں تعداد منظور ہوئی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۸۰) دوسری جانب پنجاب میں ۶۰ سے گھٹا کر ۵۰ اور بنگال میں ۵۲ سے گھٹا کر ۴۰ کر دیا گیا۔ ان دونوں جگہ کی اکثریت ختم کر کے مسلمانوں کی حیثیت کو بے وقعت کر دیا گیا۔ غور سے دیکھا جاوے تو اس میثاق میں مسلمانوں کا فائدہ شمہ برابر بھی نہ تھا۔ فائدہ صرف انگریز کا تھا کیونکہ ⅓ نمائندے گورنر کے نامزد کردہ ہوتے تھے۔ بنگال اور پنجاب کے مسلمان لامحالہ ان کے دست نگر ہو گئے مگر مسٹر جناح پر اُس زمانہ میں قوم پرستی سوار تھی۔ آپ نے اُسی سال کے خطبہ صدارت میں فرمایا۔

ہندوستان ہم سب کی پہلی اور آخری منزل ہے۔ ص۱۳۵ تاریخ مسلم لیگ۔

اسی خطبہ صدارت میں آپ نے اس اعتراض کا کہ جمہوری مجالس مشرق میں بار آور نہیں ہو سکتیں" جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ کیا ہندو مسلمان قبل ازیں جمہوریت سے ناآشنا تھے۔ یہی پنچایت کیا تھی۔ اسلامی تعلیمات کے درخشندہ روایات و ادبیات کس امر پر شاہد ہیں۔ دنیا کی کوئی قوم جمہوریت میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو کہ اپنے مذہب میں بھی جمہوری نکتہ نگاہ رکھتے ہیں۔

(تاریخ مسلم لیگ ص۱۳۲)

اسی سال مسز اینی بسینٹ نے ہوم رول کی تجویز پیش کی جسکی مسلم لیگ نے موافقت کی ۵؎

(۳) انگریز کی فریب کاری　جنگی حالات انگریز کو سراسیمہ کئے ہوئے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے اتفاق سے اس کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہندو مسلم بلوے اس کے لئے نسخہ شفا تھے۔ چنانچہ ان کا آغاز ہوا۔ تقریباً ۱۹۱۳ء کے ختم پر اجودھیا میں قربانی پر جھگڑا ہوا۔ اور حکام نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دے کر قربانی بند کر دی ۱۹۱۴ء میں مظفر نگر میں گاؤکشی پر بلوہ ہوا۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور کہا جانے لگا کہ حکام وقت رعایا میں اختلاف ڈلواتے ہیں۔ اور عام خیال یہ ہو گیا کہ فرقہ وارانہ مصالحت ہو کر جب ہندوستان کا قدم آگے بڑھنے لگتا ہے تو اندرونی طور پر نفاق کی آگ ایسی بھڑکائی جاتی ہے کہ تمام بنے بنائے کاموں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کے مشہور میثاق اور فرقہ وارانہ اتحاد کے ۹ ماہ بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۱۷ء کو اضلاع آرہ، شاہ آباد، بلیا، اعظم گڑھ میں چالیس میل کے رقبہ میں ایسے پیمانہ پر ہندو مسلمانوں کے بلوے ہوئے۔ جن کی نظیر اس وقت تک ہندوستان کی تاریخ میں نہ تھی بیان کیا گیا ہے کہ ۲۵ ہزار ہندوؤں نے منظم طور پر دیہات کے مسلمانوں پر حملہ کیا۔

۵؎ تاریخ مسلم لیگ مصنفہ مظہر صاحب انصاری۔ بی۔ اے۔ آنر ص ۱۷۱

ہوم رول لیگ نے یکم ستمبر ۱۹۱۶ء سے اپنی تحریک مسز اینی بسینٹ کی قیادت میں شروع کی۔ اس کا مقصد بھی آئینی ایجی ٹیشن سے ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری حاصل کرنا تھا۔ اس لئے نہیں کہ میدان جنگ میں ہندوستان نے انگریز کا ساتھ دیا ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا حق ہے اور انصاف کا تقاضہ ہے ص ۱۷۱ تاریخ مسلم لیگ۔

مگر غنیمت یہ ہے کہ اس سال ان فسادات کی آگ ملک میں نہیں پھیلی۔ لیکن دونوں قوموں کے لیڈر اس وقت اعتدال پر تھے۔ ان بلووں سے سمجھوتہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

شاہی اعلان اور مسٹر مانٹیگو کی آمد حتیٰ کہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو کنگ کا مشہور اعلان حکومت خود اختیاری کی بابت شائع ہوا۔ جس میں ہندوستان کو

لے روشن مستقبل صد۳۵۲ ان اطراف کے رہنے والے مسلمانوں سے جو واقعات زبانی سُنے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب نرغہ میں مبتلا ہو کر خدا کی طرف رجوع کریں تو کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ یعنی بسا اوقات تھوڑی سی جماعت بڑی جماعت پر خدا کے حکم سے غالب آجاتی ہے) اور خداوند عالم کی غیبی نصرت و امداد کا مظاہرہ اب بھی ہوتا ہے ۱۲۔

لے روشن مستقبل صد۳۹۹ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں کہا گیا، پارلیمنٹ کی پالیسی جس کا اعلان کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کی تعداد مسلسل بڑھائی جائے تاکہ اس سے برٹش انڈیا میں سلطنت برطانیہ کے اہم جزو کی حیثیت سے ذمہ دار حکومت کا مسلسل احساس پیدا ہو (روشن مستقبل صد۴۰۲) اس اعلان کی تجدید دوبارہ ۹ رفروری ۱۹۲۱ء کو جدید اسمبلی کے افتتاح کے وقت بادشاہ کی طرف سے ڈیوک آف کیناٹ نے کی۔ آپ نے فرمایا۔

"سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردان ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کے لئے سوراج کے خواب دیکھ رہے تھے آج میری

(بقیہ حاشیہ بر صد۱۸۴)

ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ تھا۔ اس کا سہرا مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کے سر پر تھا جو چند ماہ بعد خود ہندوستان تشریف لائے اور والسرائے کے ساتھ ملک میں دورہ کر کے پبلک کے خیالات معلوم کئے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۱۸۳)

سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی اہتمام ہو رہی ہے اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں جن سے میری نوآبادیات کے مانند آزادی حاصل ہو"۔ (روشن مستقبل ۳۹۵) اس تقریر کے بعد والسرائے ڈیوک آف کیناٹ کی تقریریں ہوئیں جن میں واضح الفاظ میں بیان کیا گیا۔

اب مطلق العنان حکومت کا اصول قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔ بس اس وقت سے ہندوستان معتدبہ درجہ میں اپنا بوجھ خود اٹھائیگا۔

(روشن مستقبل ۳۹۵)

لیکن انگریزی کی یہ دورنگی بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس اعلان سے اگلے سال جبکہ واقعات ناسازگار ہو گئے۔ تحریک بند ہو گئی۔ مسٹر گاندھی گرفتار کر لئے گئے اور بقول مصنف روشن مستقبل گاندھی جی کا انجن ٹھنڈا ہو کر انجن گھر میں داخل ہو گیا اور عوام الناس کی بھاپ ٹھنڈی ہو گئی اور ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو انھیں مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے جنھوں نے مسٹر مانٹیگو کو مسودہ اصلاحات بنانے کے لئے بڑے شدومد سے ہندوستان بھیجا تھا ۲ اگست ۱۹۲۲ء کو پارلیمنٹ کے اجلاس میں فرمایا۔ کہ اگر پہلے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۸۵)

میثاق لکھنؤ کی تکمیل کے باوجود کوشش کی گئی کہ مسلمان اس سے ہٹ جائیں اس کے لئے جماعت تیار کی گئی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور کانگریس اور مسلم لیگ کی متحدہ عرضداشت وزیر ہند کی خدمت میں پیش کی گئی۔

مسلم لیگ اور کانگریس کا تعلق اس زمانہ میں تعلیم یافتہ طبقوں تک محدود تھا جو آئینی طور پر متحدہ مطالبات پیش کر رہے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں عام اضطراب اور بے چینی تمام ہندوستانیوں میں محسوس کی جارہی تھی۔ جس کی وجوہات حسب ذیل بیان کی گئی ہیں [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) سے یہ بات صاف نہیں ہے تو اب میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔ جو بات خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندستانی بحیثیت جماعت مقننہ کے یا بحیثیت مدبران ملک کے خواہ کیسے ہی کامیاب ہوں مگر میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہ ہوگا کہ ان کا کام انگریزی عہدہ داروں کی ایک تھوڑی مقدار کے بغیر چل سکے گا جو ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں کل بارہ سو ہیں۔ (روشن مستقبل ص۱۰۱) آپ نے فرمایا کہ انگریز افسران ملازمت کی تمام عمارت کے لئے بمنزلہ فولادی قالب کے ہیں۔ اگر اس قالب کو ہٹالیا جائے تو تمام عمارت منہدم ہو جائے گی (ص۱۰۲ روشن مستقبل) صاحبزادہ آفتاب احمد صاحب نے جو اس زمانہ میں لندن میں ٹھیرے ہوئے تھے بہت واویلا مچایا مگر کون سنتا ہے؟

[1] ملاحظہ ہو ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ۔ ترجمہ لاجپت رائے ساہنی۔

(۱) چار سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ تک برطانیہ کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان بھی جنگ میں شریک رہا۔ ہندوستان نے بہت بڑی فوج مہیا کی جس کی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی۔ پنجاب نے سب سے زیادہ یعنی چار لاکھ آدمی بہم پہنچائے تین قرضہائے جنگ ہندوستان نے ادا کیے۔ دس کروڑ پونڈ (تقریباً دو ارب روپیہ) اسے سلطنت کی جنگ میں مدد دی۔ اور آدمیوں اور روپیوں سے مدد دینے کے علاوہ مختلف طریقوں سے بالواسطہ بہت امداد دی۔ مگر جنگ کی وجہ سے ضروریات زندگی بہت گراں ہو گئیں اور متوسط الحال اور ان غریب آدمیوں کو بہت تکلیف ہوئی جن کی آمدنی معینہ تھی۔ سفر کرنے کی آسانیوں میں کمی ہو جانے اور مال سوداگری کی درآمد برآمد میں دقتیں پیش آنے سے لوگوں کو بہت پریشانی رہی مزید برآں قانون تحفظ ہند اور قانون پریس کے عمل درآمد نے آزادی کے عام معیار پر یورش کر رکھی تھی۔

(۲) زمانہ جنگ میں تمام تکالیف اگرچہ سختی سے محسوس کی جاتی تھیں مگر خیال تھا کہ جنگ ختم ہونے پر یہ تمام تکالیف دور ہو جائیں گی۔ لیکن نومبر ۱۹۱۸ء میں ہنگامی صلح ہو جانے پر غیر معمولی حالتیں اور بھی شدید ہو گئیں۔ معمولی آدمی اپنی حالتوں سے بیزار ہو گئے۔ ۱۹۱۸ء میں بارش کی کمی کی وجہ سے قحط نازل ہوا۔ [۱]

---

[۱] اقتصادیات کے ماہر واقف ہیں کہ اب اقتصادی اصول پر بھی قحط پیدا کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ضرورت محسوس کی گئی کہ لوگوں کو پریشان کیا جائے تاکہ وہ شورش کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں تو آسان صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک لاکھ من غلہ کا آرڈر کم نرخ پر دیدیا جائے لامحالہ بازار میں غلہ کا نرخ گھٹ جائیگا

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۷ پر)

اور پھر انکم ٹیکس وصول کرنے کے لیئے نہایت سخت اور نفرت انگیز قوانین کے ذریعہ سے آمدنیوں کی تحقیق و تفتیش کی گئی۔

پنجاب کے متعدد اضلاع میں انکم ٹیکس ۱۰۰ فیصدی سے ۲۰۰ فیصدی تک بڑھادیا گیا۔ قانون تحفظ ہند کے ماتحت گیہوں کے ذخیرے ضبط کئے گئے۔ بدنی کی ممانعت کردی گئی۔ غربا کے لئے غلوں کا نرخ کم کیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ

(۴)

منافقت ایک طرف ۱۸ اگست ۱۹۱۷ء کو شاہی اعلان کے ذریعہ سے حکومت خود اختیاری کی توقعات دلائی گئیں۔ مگر یہی زمانہ وہ تھا جبکہ رولٹ ایکٹ کمیٹی اپنی تحقیقات میں مصروف تھی جس نے ۱۸ جنوری ۱۹۱۹ء کو وہ مسودے شائع کئے جن کا نام "رولٹ بلز" تھا جن کے ذریعہ سے قانون تحفظ ہند کو گویا دوامی کردیا تھا اور زمانہ جنگ میں ہندوستانیوں کی وفاداری کا معاوضہ ایسے جابرانہ قانون سے دیا گیا تھا جس کے ذریعہ سے غلامی کی زنجیروں کو بہت زیادہ کس دیا۔ حکام کو مندرجہ ذیل اختیارات دیئے گئے[1]۔

(۱) ضمانتیں مع مچلکہ یا بغیر مچلکہ کے طلب کرنا۔

(۲) کسی شخص کی بود و باش کو ایک جگہ میں محدود کردینا یا اُسے حکم دینا کہ اپنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۶) پھر اسی طرح اگر دس مرتبہ غلہ کا آرڈر دیا گیا اور ہر مرتبہ آدھ سیر نرخ کم کردیا تو غلہ بجائے دس سیر کے ۵ سیر کا ہوجائیگا۔ باشندگان ملک پریشان ہوجائیں گے اور خود اپنی پریشانی میں مبتلا ہوکر سیاسی ترقی کے جذبات فراموش کر بیٹھیں گے۔ [1] رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ۔

نقل وحرکت کی اطلاع دیتا رہے۔

(۳) بعض افعال سے باز رہنے کا حکم دینا۔ (مثلاً اخبار نویسی۔ پرچے تقسیم کرنا۔ یا جلوس میں شریک ہونا)

(۴) اس امر کا حکم دینا کہ کوئی شخص وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی کی رپورٹ پولیس کو دیا کرے۔

(۵) گرفتار کرنا۔

(۶) وارنٹ کے ماتحت تلاشی لینا۔

(۷) بطور تعزیر حراست میں مقید رکھنا۔

(۸) جو ہندوستانی دیگر ممالک میں ہیں ان کو داخلہ ہند سے روک دینا۔

یہ تھا انعام جو رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے الفاظ میں ہندوستانیوں کو دیا گیا۔ جس کی رو سے ہر ایک ہندوستانی کو مشتبہ قرار دے کر ہر قسم کے ظلم روا رکھنے کے لئے وجہ جواز پیدا کر دی گئی۔

منافقت کی ایک دوسری مثال یہ تھی کہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء کو ذیل کا اعلان ہر شہر، قصبہ بلکہ گاؤں میں۔ اور نہ صرف ہندوستان بلکہ سوڈان اور افریقہ میں بھی تقسیم کیا گیا۔

"برطانیہ عظمیٰ اور ٹرکی میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے، جو دولت عثمانیہ نے قصداً بغیر کسی دھمکی دیے جانے کے غلط مشوروں سے شروع کی ہے۔ ملک معظم کی گورنمنٹ ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند کو اختیار دیتی ہے کہ وہ عرب کے مقدس مقامات۔ اور عراق کی مقدس زیارت گاہوں اور جدہ کے ساحل کے متعلق ایک عام اعلان

کردیں تاکہ ملک معظم کی ایک بہت ہی وفادار ہندوستانی مسلم رعایا کو اس جنگ کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔ مذہبی سوال سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اعلان یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اور جدہ برطانیہ کی بحری اور بری فوج کے حملہ اور دست برد سے بالکل محفوظ رہیگا تاوقتیکہ ہندوستانی حاجی اور زوار کی آمدورفت میں دست اندازی نہ کی گئی۔ ملک معظم کی گورنمنٹ کے کہنے سے فرانس اور روس کی حکومتوں نے بھی اسی قسم کا اطمینان دلایا ہے۔ ۲ر نومبر ۱۹۱۴ء[1]

اس کے بعد اس اعلان کا کوئی حرف بھی شرمندہ وفا نہ ہوسکا۔

(۵)

تحریک ستیہ گرہ

جنگ عمومی کے ختم ہوجانے پر ہندوستانی غلام جو موت سے بچے تھے ہندوستان واپس کئے گئے۔ ہندوستان پہنچتے ہی ایک طرف رولٹ ایکٹ کا انعام ان کو ملا اور دوسری جانب قحط سالی نے (جو خود ہوگئی تھی یا ہندوستانیوں کو پریشانی اور فاقہ اور بھوک میں مبتلا کرانے کے لئے کرائی گئی تھی) ان کے پیٹ خالی کردیے اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے بلبلانے کا وہی دلخراش نظارہ دیکھنے لگے جس سے نجات پانے کے لئے فوج میں بھرتی ہوکر موت کے منھ میں گئے تھے

اس وقت جنرل اڈوائر اور ان کے ہم مشرب سفید فام درندوں کو افغانستان بھی ہوّا بن کر نظر آنے لگا کیونکہ افغانوں نے جنرل نادرخاں کی زیرقیادت انگریزی

---

[1] ترک موالات مصنفہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب ص۲۳

فوجوں کو متعدد پہاڑی موروں پر شکست دیدی تھی۔

جنرل اڈوائر وغیرہ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ پنجاب کے کسی ضلع میں کاشتکار لوگ ظلم پر اتر آئے تھے۔ ان میں سے کچھ کہتے تھے کہ برٹش گورنمنٹ کا خاتمہ ہو گیا نیز معلوم ہوا تھا کہ فوج میں بغاوت پھیلانے کی بھی کوشش کی جارہی ہے ریلوے ملازمین کو اسٹرائک پر آمادہ کیا جارہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

بہرحال اس میں شک نہیں کہ شہیدان حریت کا خون رنگ لا رہا تھا۔ غضب آلود جذبات کی لہریں تمام ہندوستان بالخصوص دہلی سے کابل تک دوڑ رہی تھیں۔ انقلاب کے لئے طبل جنگ بجایا جاسکتا تھا۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ اب جرمنی ختم ہو چکا تھا۔ ترکی سلطنت فنا ہو گئی تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کی طاقت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب کے امکانات جو دوران جنگ میں حاصل تھے ایک ایک کرکے ختم ہو چکے تھے۔ برطانوی حکام کے تکبر اور غرور کا پارہ حرارت سب سے اونچے خط پر پہنچا ہوا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ تشدد کے ذریعہ رعایا کے سیاسی جذبات کو بجھا کر ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

محبان وطن کے لئے اس وقت ایک اہم سوال یہ تھا کہ جذبات حریت کو کس طرح باقی رکھا جائے۔

بلاشبہ اس وقت مسٹر گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن رسا نے ہنتی رعایا کے لئے ستیہ گرہ کا ایک عجیب و غریب نسخہ[ع] ایجاد کیا۔ چنانچہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو

ع یا مقاومۃ بالصبر جس کی تلقین قرآن حکیم میں ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے استعینوا بالصبر والصلوٰۃ نیز ارشاد ہے کفوا ایدیکم واقیموا الصلوٰۃ ۱۲

بمبئی میں ستیہ گرہ سبھا قائم ہوئی اور اعلان کیا گیا کہ جو لوگ ستیہ گرہ کا حلف اٹھائیں وہ سول طور پر رولٹ ایکٹ کی مخالفت کریں گے۔ نیز ان قوانین کا جن کا سبھا کمیٹی وقتاً فوقتاً نام بتلائے لے

اس عجیب غریب نسخہ نے رعایا کو خفیہ سوسائٹیاں قائم کرنے سے بے نیاز کر دیا۔ جو باتیں پہلے خفیہ کی جاتی تھیں اب علانیہ کی جانے لگیں۔ جیلوں کی کوٹھریاں تفریح گاہ ہو گئیں جن میں لوگ جوق جوق جانے لگے۔

حکام کو کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا کہ تشدد کے ذریعہ سے حد درجہ بزدلی پیدا کرنے کے بعد رعایا میں اس قدر جرأت پیدا ہو جائے گی کہ وہ فوج کی بندوقوں اور پولیس کی لاٹھیوں کی ضربوں کو شاداں و فرحاں برداشت کریں گے۔ ان جدید حالات نے حکام کو بدحواس کر دیا۔ ۲ے

جلیانوالہ باغ اور مارشل لا

ان بے چینیوں کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے جو تمام ہندوستان میں عام تھیں اور بالخصوص پنجاب کو ایک بغاوت پر آمادہ کر چکی تھیں یہ بھی گذر چکا کہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو ستیہ گرہ کی تجویز مقابلہ کے لئے پاس ہو گئی۔ چنانچہ اس پر عملدرآمد شروع ہوا۔ امرتسر اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں ۳۰ر مارچ اور ۶ر اپریل کو ہڑتالیں ہوئیں اور گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ۹ر یا ۱۰ر اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کر کے جلاوطن کئے گئے۔ نیز یہ شہرت ہو گئی کہ مسٹر گاندھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس سے پنجاب میں عام ہیجان پیدا ہو گیا۔ ۱۳ر اپریل کو

لے روشن مستقبل صفحہ ۳۹۶ رپورٹ ہنٹر کمیٹی لاجپت رائے ساہنی ۲ے روشن مستقبل صفحہ ۳۹۶

حکومت پنجاب نے حکومت ہند سے مارشل لا کی اجازت چاہی اور ۱۵ اپریل کو لاہور اور امرتسر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

جلیانوالہ باغ

امرت سر میں ۱۰ اپریل کو گرفتاریوں کی خبر سے ایک ہیجان پیدا ہوا۔ ایک عام انبوہ نے بینک پر حملہ کر دیا۔ افسروں کو قتل کر ڈالا۔ اور عمارتوں کو آگ لگا دی۔ یہ شورش تھوڑی دیر میں ختم ہو گئی پولیس اور فوج کا کافی انتظام امن بحال کرنے کے لئے کر دیا گیا۔ جنرل اڈوائر ایک فوج کا کمانڈر ہونے کی حیثیت سے ۲ لاکھ فوج لے کر امرت سر پہنچا۔ ۱۳ ر کی صبح کو جنرل اڈوائر نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا۔

> شہر کے بازاروں میں یا شہر کے کسی حصہ میں یا اس کے باہر کسی وقت بھی کسی قسم کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں۔ اس قسم کا جلوس یا چار آدمیوں کے اجتماعات کو مجمع خلاف قانون سمجھا جائے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو ہتھیاروں کے ذریعہ سے اُن کو منتشر کیا جائے گا۔ [1]

جنرل ڈائر نے اپنی فوج لیکر شہر کے کچھ حصہ کا گشت کیا اور اس حکم کو خود مشتہر کیا۔ لیکن جب وہ ۱۲ بجکر ۴۰ منٹ پر اپنے کیمپ واقع رام باغ میں واپس آیا تو اس کو خبر پہنچائی گئی کہ شام کو ۴½ بجے جلیانوالہ باغ میں عام جلسہ ہوگا وہ جلسے کے وقت مشین گنیں اور فوج لیکر جلیانوالہ باغ پہنچا۔ راستہ کی تنگی کے باعث مشین گنیں باغ تک نہیں پہنچ سکیں وہ فوج کے ایک دستہ کو اندر لے گیا اور تمام راستہ گھیر کر فوج کو کھڑا کر دیا۔ مجمع کی تعداد

---

[1] رپورٹ ہنٹر کمیٹی ۱۹۲۰ء

تقریباً پندرہ ہزار تھی - ایک شخص اسٹیج پر تقریر کر رہا تھا - جنرل ڈائر نے بلا کسی تنبیہہ اور اطلاع کے فائر کا حکم دیدیا -

سرکاری بیان کے بموجب یہ فائر اس وقت تک ہوتے رہے جب تک فوج کے پاس کے کارتوس ختم نہ ہو گئے - پہلی گولیاں چلتے ہی لوگ سب طرف سے بھاگنے لگے - لیکن آج معافی کا سلسلہ بند تھا - فائر برابر جاری رکھے گئے حتیٰ کہ ۳۷۹ آدمی ہلاک اور بارہ سو زخمی ہو کر میدان میں ڈھیر ہو گئے - بہت سے لوگوں نے لیٹ کر جان بچانی چاہی مگر اُن پر اسی طرح فائر کئے گئے - [1]

تعداد مقتولین

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن تحریر فرماتے ہیں -

ہمارے دشمنوں نے جلیانوالہ باغ کے مقتولین کی تعداد بھی بڑھا چڑھا کر پیش کی ہے - چنانچہ وہ اصرار کے ساتھ کئی ہزار کی تعداد بتلاتے تھے - اگرچہ مجھے ان کی صحیح تعداد یاد نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ چند منٹوں میں پندرہ سو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا [2]

اس خونی ہنگامہ کی پوری تفصیل کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے - در بطور مشتے نمونہ از خروارے"، مسٹر موصوف کے حوالہ سے صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے -

سوال - تمہیں کس وقت علم ہوا کہ تمہارا خاوند باغ میں قتل کر دیا گیا -

جواب - گولی چلنے کے کچھ عرصہ بعد میں نے اپنے بازار میں سُنا کہ ہزاروں آدمی قتل کئے گئے ہیں - یہ سُن کر میں پریشان ہو گئی اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ فی الفور باغ میں پہنچنا چاہیئے - چنانچہ دو ہمسایہ عورتوں کو لے کر وہاں پہنچی جہاں پر تمام جگہ

[1] رپورٹ ہنٹر کمیٹی ۲۹ - [2] انقلاب ۱۹۱۹ء کی تصویر کا دوسرا رخ ۱۲

مردہ لاشوں سے بھرا ہوا پایا۔ میں نے اپنے مقتول خاوند کی لاش کو اُن میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ چنانچہ لاشوں کے انبار کے نیچے سے میں نے اپنے خاوند کی لاش کو کھینچکر باہر نکالا۔

وہ تمام جگہ خون کا تالاب نظر آتی تھی۔ میں نے اس لاش کو گھر پہنچانے کے لئے امداد کی تلاش کی۔ مگر ناکام رہی۔ آخرکار مایوس ہوکر واپس آگئی اور اپنے خاوند کی لاش کے پاس بیٹھ کر اسی طرح تمام رات گذاردی۔ جہاں پر کتوں کی کثرت کی وجہ سے مجھے اکثر چھڑی استعمال کرنی پڑتی تھی۔ رات کے دو بجے ایک سکھ زخمی کے کراہنے کی آواز سنکر اس کے پاس گئی اور اس کی ٹانگ کو ٹھیک کرکے رکھ دیا۔ جس سے اس غریب کو کسی قدر افاقہ ہوا۔ وہاں پر ایک بارہ سال کا زخمی بچہ بھی تھا۔ جو تمام شب روتا رہا اور بار بار مجھ سے یہی التجا کرتا رہا کہ میں اس کے پاس بیٹھی رہوں۔ کیونکہ اس حالت تاریکی میں وہ ڈر محسوس کرتا تھا۔ پاس ہی ایک اور زخمی تھا جو نہایت دردناک طریقہ سے تمام رات پانی کے لئے التجا کرتا رہا۔ میں نے ہر چند پانی مہیا کرنے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ ناکام رہی تمام رات زخمیوں کی دردناک چیخیں سنتی رہی یا کتوں کے بھونکنے اور گدھوں کے ہنہنانے کی مکروہ اور بھیانک آوازیں آتی رہیں لیے خدا جانے کتنی غریب عورتیں ہوں گی جو اپنے نوجوان جگر پاروں یا سرتاج شوہروں کی لاش بھی نہ دیکھ سکیں۔

غرور اور درندگی کا آخری نمونہ یہ ہے کہ اڈوائر سے اتنا بھی نہ ہوا کہ

---

۵ انقلاب کی تصویر کا دوسرا رُخ۔

شفا خانوں میں پہنچوانے کی اجازت دیدیتا یا او لیا اور وارثوں کو اجازت مل جاتی کہ وہ اپنے عزیزوں کی لاشیں اٹھا لائیں۔

لطف یہ ہے کہ جنرل اڈوائر اس تمام وحشت اور بربریت کو اخلاق کی تعلیم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے تحریری بیان میں لکھا تھا

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ فائروں کی قلیل ترین مقدار تھی جس سے وہ دوررس "اخلاقی اثر" پیدا ہو جاتا جس کا مہیا کرنا میرا فرض تھا۔ اگر زیادہ فوج اس وقت مہیا ہوتی تو نسبتاً نقصان جان بھی زیادہ ہوتا۔ [1]

مارشل لا

مغرور حکومت کے جبر و قہر کا دوسرا مظاہرہ "مارشل لا" تھا۔ جو تقریباً ڈیڑھ ماہ تک پنجاب کے بیشتر اضلاع میں جاری رہا ان تمام مظالم کا بیان کرنا طوالت طلب ہے جو اس سلسلہ میں عمل میں لائے گئے ہم صرف ان بربریت نواز اعمال کی مختصر فہرست پیش کرتے ہیں جن کا مظاہرہ کیا گیا۔

(۱) لاہور میں لفٹنٹ گورنر چیف سکریٹری اور فوجی حکام کے روزانہ مشورے ہوا کرتے تھے اور ہر وقت نئے نئے احکام جاری ہوتے تھے۔ جن کی نوعیت آئندہ تحریر سے واضح ہوگی۔

شہر کے معززین کو حکم تھا کہ صبح ۸ بجے سے ۵ بجے شام تک وہ احکامات سننے کے لئے "واٹر ورکس اسٹیشن" پر حاضر رہیں اور جو حکم دیا جائے اس کو عام باشندگان شہر تک اپنی ذمہ داری سے پہنچاتے رہیں۔

(۲) شام کے آٹھ بجے سے صبح کے پانچ بجے تک باہر نکلنے کی ممانعت تھی۔

---

[1] یہ تمام مضمون ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ مترجمہ لاجپت رائے صاحب سے ماخوذ ہے۔

خلاف ورزی کی سزا گولی تھی۔ دو شخصوں کا ساتھ ساتھ چلنا ممنوع تھا۔ دس آدمیوں سے زیادہ کا اجتماع خلافِ قانون تھا۔

(۳) موٹر کار۔ اور تمام سواریاں فوجیوں کے لئے بیگار میں لے لی گئیں برقی روشنی اور پنکھے چھین لئے گئے۔ یورپین کو لائسنس دیکر اس قسم کی بیگار سے مستثنےٰ کر دیا گیا۔ کرنل فرینک جانسن نے اپنے تحریری بیان میں لکھا تھا۔

"نمبر ۳ کے مطابق تمام موٹر کاریں فوجی حکام کے لئے حوالہ کر دینے کا حکم تھا لیکن جہاں مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ یورپینوں کے کاروبار کے لئے موٹر کی ضرورت ہے میں نے ان کو مستثنےٰ کر دیا تھا۔ میں نے کسی ہندوستانی کو مستثنےٰ نہیں کیا کیونکہ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ وفاداروں اور غیر وفاداروں سب کو مارشل لا کی تکالیف کا کچھ مزہ چکھنا چاہئے تاکہ آئندہ ان کے رسوخ کا وزن تہ دل سے باغیانہ تحریک کی تائید میں نہ ہو۔

(۴) لفٹنٹ موصوف نے حکم کیا کہ مارشل لا کے تحت میں جو احکام جاری ہوں گے وہ ان تمام مالکان مکانات کے حوالہ کئے جائیں گے جن کو میں تجویز کروں اور مالکان مکانات کا فرض ہے کہ اس قسم کے تمام احکام کی نمائش کریں اور اس نمائش کو جاری رکھیں۔ خلاف ورزی کی صورت میں سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔ اگر چسپاں شدہ اعلان خراب ہو گیا تو سخت سزا دیجائے گی۔ چنانچہ سناتن دھرم کالج کے احاطہ کی دیوار پر ایک نوٹس چسپاں کیا گیا تھا۔ جس کو کسی نے پھاڑ ڈالا۔ لفٹنٹ موصوف کا حکم ہوا کہ احاطہ میں جس قدر مرد ہوں سب گرفتار کر لئے جائیں۔ چنانچہ تمام طلبہ اور پروفیسر گرفتار کر لئے گئے۔ اور تین میل ان کو

پیدل لے جایا گیا۔ ۳۰ گھنٹہ کی حراست کے بعد پرنسپل کی ضمانت پران کو رہا کیا گیا۔

(۵) اسی قسم کے معمولی شبہ کی بنا پر متعدد کالجوں کے ایک ہزار سے زیادہ طلبہ کو حکم دیا گیا کہ وہ تین ہفتہ تک حاضری دیا کریں جس کے لئے انکو روزانہ مئی کی دھوپ میں ۱۶ میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد فی صدی کے حساب سے کچھ تعداد مقرر کر کے حکم ہوا کہ ان کو کالجوں سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسی قسم کے احکام دوسرے اضلاع میں جاری کئے گئے جن کی وجہ سے چھ سالہ چھوٹے بچے بھی حاضری دینے پر مجبور تھے جن میں سے کچھ لوگ مر بھی گئے۔

(۶) حکم ہوا کہ اگر کسی جگہ کوئی بم گرا تو اس کے آس پاس کے مکانات منہدم کر دیے جائیں گے۔

(۷) امرتسر میں ایک گلی تھی جہاں ۱۰ اپریل کو مس شیروڈ پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اس گلی کے بیچ میں ایک ٹکٹکی کھڑی کر دی گئی، بلا ثبوت صرف شبہ کی بناء پر چھ آدمیوں کو پکڑ کر اس ٹکٹکی سے باندھ کر تازیانے لگوائے گئے۔

تمام آدمی جو اس گلی سے گذریں، خواہ وہ اس گلی کے رہنے والے ہوں یا کسی اور محلہ کے وہ اس گلی سے صرف رینگتے ہوئے گذر سکتے تھے۔ یعنی ہاتھ زمین پر ٹیک کر بندر کی طرح چلیں۔ اتفاق سے یہ گلی بہت لانبی تھی اور اس کے گذرنے والوں کو اسی طرح سے گذرنا پڑتا تھا۔ ورنہ وہ گرفتار کر لئے جاتے اور تازیانے وغیرہ کی سزا دی جاتی۔

(۸) لائلپور میں حکم کیا گیا کہ جب کوئی انگریز سامنے سے گذرے تو ہر ایک ہندوستانی گاڑی سے اُتر کر اور اگر چھتری لگائے ہو تو چھتری بند کرکے مؤدب کھڑے ہو کر سلام کریں۔

کسی ایک اسکول کے دو طالب علموں نے سلام نہیں کیا تو تمام اسکول کے طلبہ کو حکم ہوا کہ وہ دفتر کے سامنے حاضر ہو کر یونین جیک کی سلامی دیں، انکے ماسٹر رجسٹر لے کر ساتھ آئیں۔ غیر حاضروں کو سخت سزا دی جائے وغیرہ وغیرہ۔

(۹) "قصور" میں ایک اسکول ماسٹر نے رپورٹ کی کہ اس کے لڑکے اس کے قابو میں نہیں رہے۔ مارشل لا کے افسروں نے طے کیا کہ تمام لڑکوں کو سزا دینے کے بجائے چند لڑکے چھانٹ لیے جائیں۔ چنانچہ اسکول ماسٹر نے چھ لڑکوں کو سزا کے لئے منتخب کیا۔ افسران مارشل لا نے جب ان کو دیکھا تو اس وجہ سے کہ وہ دُبلے پتلے تھے ان کو چھوڑ کر چھ موٹے تازے لڑکوں کو منتخب کرکے ۱۵-۱۵ تازیانے لگوا دیے۔ کچھ لڑکے گرفتاری سے بچنے کے لئے فرار ہو گئے تو ان کے والد اور قریبی رشتہ داروں کی جائیدادیں ضبط کرلی گئیں۔

سرکاری رپورٹ کے بموجب اس قسم کے احکام کی خلاف ورزی میں متعدد اضلاع میں (۲۵۸) آدمیوں کو ۵ سے لے کر ۳۰ تک تازیانہ کی سزا دی گئی۔

(۱۰) فوجوں کے دستے دیہات میں بھیجے گئے جہاں انہوں نے اندھا دھند جس کو چاہا پکڑ کر کوڑے لگائے اور سزائیں دیں۔ مقصود یہ تھا کہ آئندہ بغاوت میں شریک نہ ہوں۔

(۱۱) متفرق دیہات پر محض مرعوب کرنے کی خاطر ہوائی جہازوں سے بم پھینکے

گئے اور مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کی گئی جن سے نقصان مال بھی ہوا اور نقصان جان بھی۔ قصور کچھ نہ تھا البتہ وحشت اور بربریت کا یہی تقاضا تھا۔

(۱۲) اس جُرم میں کہ کچھ لائنیں اکھاڑ دی گئی تھیں ٹرینوں میں مسلح سپاہی سوار کر کے روانہ کئے گئے اور یہ حکم ہوا کہ جو دیہاتی لائن کے آس پاس ملیں اُن کو گولی ماردو۔

ایک گاؤں ریلوے لائن کے قریب تھا وہاں کچھ آدمی نظر آئے۔ لالہ سریرام سود جو اس ٹرین کا افسر تھا اور فوجی سولجر ٹرین سے نیچے اترے اور ان پر فائر کرنے شروع کر دیئے۔

(۱۳) دیہات کے باشندوں کو حکم دیا گیا کہ وہ نمبردار لائنوں کے پاس پہنچیں اور ان کی حفاظت کریں۔ خلاف ورزی کرنے پر ان کا گاؤں تباہ کر دیا جائے گا۔ غریب دیہاتیوں کو ایسا کرنا پڑا۔

(۱۴) شہری علاقوں کے لئے یہ بھی دھمکی دی جاتی تھی کہ اگر مارشل لا کی خلاف ورزی ہوئی تو اسی روز پانی اور روشنی بند کر دی جائے گی۔

مارشل لا کا مقصد یہ تھی ان وحشیانہ مظالم کی مختصر فہرست جو مارشل لا کے سلسلے میں روا رکھے گئے۔ تحقیقاتی ٹریبونل کے سامنے شہادت دیتے ہوئے انگریزی افسران نے بیان کیا کہ مظالم برپا کرنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ

"ہندوستانیوں کے دماغ سے بغاوت کے جذبات فنا کر دیئے جائیں"

حصولِ آزادی کے لیے پروگرام

گذشتہ تحریر کسی قدر طویل ہو گئی۔ اور ممکن ہے ناظرین کرام بے جوڑ بھی تصور کریں۔ مگر ہمارا یہ منشا تھا کہ آئندہ جو پروگرام اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے تجویز کیا گیا۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع مل سکے۔

آجکل شد و مد سے کہا جاتا ہے کہ علماء ملت دوسری قوموں سے مل کر ستیہ گرہ یا سول نافرمانی کی تحریک میں کیوں شریک ہو گئے۔ آج مسلمانوں کے رجعت پسند لیڈر ستیہ گرہ یا سول نافرمانی کو خودکشی قرار دے رہے ہیں ایک عام پروپیگنڈا ہے کہ علماء آیاتِ جہاد کو بھول گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ۱۹۱۵ء تک علماء ملت کی خدمات جو نہایت دیانتداری اور موثق حوالجات سے پیش کی گئی۔ ان کے مطالعہ کے بعد ہر انصاف پسند کے لئے یہ فیصلہ آسان ہو گیا کہ علماء ملت نے اس راستہ کو نادانی یا بزدلی یا غفلت سے اختیار نہیں کیا۔

کیا اعتراض کرنے والے[1] اپنی جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی پیش کر سکتے ہیں جس نے توس مکھن اور آرام کرسی کے سوا شاہراہ انقلاب کی گرد چھانی

---

[1] یعنی ۱۹۱۹ء سے جنوری ۱۹۴۷ء تک کیونکہ فروری ۱۹۴۷ء میں اعتراض کرنے والوں نے پنجاب اور صوبہ سرحد کی وزارت حاصل کرنے کے لئے یہی راستہ اختیار کیا۔ اگرچہ ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اور ان کے لئے ستیہ گرہ فی الواقع خودکشی ثابت ہوئی۔ محمد میاں۔ ۵ رجون ۱۹۴۷ء

ہو۔ احمق پھپھوندوی کا ایک شعر ان راحت طلب مصلحین قوم کی حالت کا مرقع ہے ؂

سوچا تھا قوم کے متعلق بہت سا کام
لیکن خیال بنگلہ و موٹر میں رہ گیا

علمارِ ملت صحیح طور پر اور بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں بار ہا حریت اور انقلاب کی قربانگاہ پر خود کو پیش کیا۔ انگریزی اقتدار کی ابتدا سے آج تک ان کے خیالات۔ انقلاب کا نقشہ قائم کرنے میں اور ان کی عملی طاقتیں انقلاب کو بروئے کار لانے میں مصروف رہیں۔ حضرت سید صاحب شہیدؒ کی تحریک کے آغاز سے ۱۹۱۵ء تک یعنی صرف ۸۵ سال کے عرصہ میں ہندوستان کی صرف یہی ایک جماعت ہے جس نے چار مرتبہ انقلاب کی جدوجہد کی۔ بے عمل اعتراض کرنے والوں کے پاس اب بھی پر تشدد انقلاب کے لئے کوئی پروگرام نہیں مگر آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان بزرگانِ ملت نے واقعی طور پر ہر مرتبہ نہایت عظیم الشان نقشہ مرتب کیا اور پھر اس کے لئے ہر ایک قسم کی قربانی پیش کی۔ یہ دوسری بات تھی کہ تدبیر پر ہمیشہ تقدیر غالب آتی رہی اور کارپردازانِ قضا و قدر کا فیصلہ یہی رہا کہ ہندوستان انگریزوں کی غلامی کا دردناک عذاب چکھا رہے۔

بہرحال اب نقشہ دگرگوں تھا جس کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

(۱) جنگِ عمومی نے جرمنی اور ترکی کو شکست دے کر ان تمام توقعات کو ختم کر دیا جن کی بنا پر ۱۹۱۵ء تک انقلابی سازشیں ہوتی رہیں اور اب انگریز کی طاقت پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ گئی اور حدودِ سلطنت اتنے وسیع ہو گئے کہ ان میں آفتاب نہیں چھپتا۔

(۲) جلیانوالہ باغ اور پنجاب کے مارشل لا نے ہندوستانیوں کو کافی سبق دیدیا کہ شورش بغاوت کو ایک جابر اور قاہر حکومت کس طرح کچل سکتی ہے۔

(۳) افغانستان اور ایران کی تو کیا مجال کہ وہ برطانیہ کے مقابلہ پر ہندوستان کی تحریک انقلاب کا ساتھ دیں، ہاں زار روس کی حکومت ختم ہونے کے بعد سوویٹ روس کی حکومت برطانیہ کی مخالف تھی اور ہندوستانیوں کا ساتھ دے سکتی تھی۔ لیکن۔

(الف) لینن اور اسٹالن کے خیالات سے آج تک ہندوستانی متفق نہیں۔

(ب) علاوہ ازیں سوویٹ روس کی طاقت اس وقت تک اس قابل نہیں تھی

(ج) اس سے زیادہ اہم اور قابل غور سوال یہ ہے کہ اس صورت میں ہندوستان کو حریت نصیب ہوگی یا محض آقاؤں کی تبدیلی ہوگی اور بس۔

(د) بایں ہمہ سوویٹ یونین کا ابتدائی پروگرام جو اپنے ملک کی تعمیر تھا اور یہ پالیسی تھی کہ سوویٹ روس کسی ملک پر حملہ کر کے انقلاب نہیں پیدا کرے گا بلکہ خود ملک میں سوشلزم اور کمیونزم کھیلا کر وہاں کی تحریک کی امداد کریگا تاکہ وہ قوت حاصل کر کے انقلاب کرے اور اپنے ملک کو آزاد کرائے اور اس پر قابض ہو۔

(۴) جبکہ کوئی بیرونی طاقت پشت پر نہ ہو تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اسلحہ اور قوت کے ساتھ انقلابی جدوجہد کے لئے خرچ کا کیا انتظام ہو۔

جدید اسلحہ حرب کے ایجاد نے خرچہ جنگ اس قدر بڑھا دیا ہے جو ہمارے

حدو حساب سے بھی بالا ہے۔ ۱۸۵۷ء تک سامانِ جنگ بندوق یا معمولی درجہ کی توپوں کا نام تھا۔ لیکن اب ہوائی جہاز، مشین گن۔ بم کے گولے ٹینک وغیرہ کی ایجاد کے باعث خرچہ جنگ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بقول علامہ شکیب ارسلان جنگِ عمومی میں تمام حکومتوں کے تقریباً "۱۲ ارب پونڈ" خرچ ہوئے۔ یعنی دو سو ارب روپیہ یعنی سالانہ پچاس ارب روپیہ یومیہ تقریباً ۱۵ کروڑ۔[۱] آپ تمام حکومتوں کے مصارف جنگ کو چھوڑیے۔ صرف اپنے ہندوستان کو لیجیے جس نے قرضہ جنگ کے سوا دس کروڑ پونڈ یعنی تقریباً دو ارب روپے سے جنگِ عمومی میں برطانیہ کی امداد کی اور اپنی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کیا۔

بالفاظ دیگر تقریباً تیرہ لاکھ روپے روزانہ انگریزوں کو دیتا رہا۔

(۵) اس سے بھی زیادہ اہم سوال ایک اور ہے۔ جو علماء سے زیادہ اعتراض کرنے والے حضرات کے لئے قابل غور ہے جن کا نظریہ ہے کہ ہمیں دنیائے اسلام کے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف اپنا انتظام کرنا ہے۔[۲]

---

[۱] دوسری جنگ عظیم از ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء کا خرچہ اس سے بدرجہا بڑھ گیا ہے۔ حتی کہ صرف برطانیہ کا خرچہ جنگ روزانہ ۲۰ کروڑ روپیہ تھا۔

[۲] مسٹر محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس نہم منعقدہ لکھنؤ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۶ء کے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا۔ ہندوستان ہی ہم سب کی پہلی اور آخری منزل ہے۔ تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۱۳۵ مصنفہ مرزا اختر حسن صاحب بی۔ اے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کسی کے طفیل میں کچھ آزادی حاصل کر بھی لے تو آیا اس کو باقی بھی رکھ سکے گا یا نہیں۔ دنیا نے ہمیشہ ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھا اور آج بھی وہ اپنی زرخیزی کے لحاظ سے سونے کی چڑیا ہے اور دنیا کی حکومتیں اُس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ ہندوستان ہمیشہ فاتحین کا قبلہ گاہ رہا اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ ہر آنے والے کے سامنے گردن جھکاتا رہا۔ سبب کیا ہے؟

وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستانی کو اپنے ہندوستانی ہونے کا کبھی احساس نہیں ہوا، اور اس ملکی اور وطنی جذبہ کے فقدان سے وہ دوسروں کا غلام اپنی قوم کا غدار بنتا رہا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں آزادی حاصل کرنا اور اس کو باقی رکھنا صرف اس پر موقوف ہے کہ اہل وطن کے دل جذبات وطنیت سے اتنے پُر ہوں کہ ان کو قربانیوں پر آمادہ کر سکیں۔ افغانستان کبھی کسی کا غلام نہیں بنا۔ انگریزوں نے بارہا حملہ کیا۔ دو مرتبہ فتح بھی کر لیا۔ مگر ہر مرتبہ تھوڑے دنوں بعد نکلنا پڑا۔ کیونکہ پٹھان کی غیرت نے اپنے اوپر غیر قوم کی حکومت گوارا نہیں کی۔

اب جبکہ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے تو اس کی حریت کا حصول اور پھر بقا صرف اس پر موقوف ہے کہ ہندوستانیوں کے دل جذبات وطنیت سے لبریز ہوں اور مذہبی اختلافات کو اپنی حد پر رکھتے ہوئے وطن کے معاملہ میں ایک قوم کی حیثیت سے تمام دنیا کے مقابلہ پر آئیں۔

یہی وہ "متحدہ قومیت" ہے جس کو کفر و شرک کا مُرادف بنایا جا رہا ہے۔

کیونکہ انگریز کے لئے پیغام فنا یہی قومیت ہے۔

علماء ملت اور پُر امن جدوجہد

(۶) سیدنا حضرت شیخ الہندؒ کی انقلابی جماعت جبکہ انقلاب کے بعد جمہوری حکومت قائم کرنا چاہتی تھی جس کی صدارت کے لئے "راجہ مہندر پرتاب" اور بقول ارکان رولٹ کمیٹی وزارت کے لئے ہردیال اجیت سنگھ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی وغیرہ وغیرہ کو منتخب کر لیا گیا تھا تو یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ شیخ الہند دنیا کی سیاست سے قطعاً علیحدہ کوئی ایسی حکومت ہندوستان میں قائم کر رہے تھے جس میں ہندو کی حیثیت صرف ذمی کی ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ کا نصب العین مکمل آزادی اور پروگرام انقلابی اور پُرتشدد تھا اور اسی وجہ سے ان حضرات نے کانگریس کی طرف توجہ نہیں کی تھی لیکن اب جبکہ جرمنی کی شکست نے سیاست کا نقشہ بالکل ہی پلٹ دیا تو علماء ملت نے دوسرے راستہ کی تلاش شروع کی۔ چنانچہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد کے دور میں جب دسمبر ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا گیارھواں اجلاس انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کے ساتھ دہلی میں ہو رہا تھا تو مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی مرحوم۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب۔ مولانا عبد اللطیف صاحب بلوچستانی مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری وغیرہ وغیرہ نے مسلم لیگ کے اجلاس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ اس اجلاس میں بہت نمایاں حصہ لیا[1]۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری

---

[1] مگر مرزا اختر حسن صاحب اس اجلاس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کا گیارھواں اجلاس بالکل بیجان اجلاس تھا۔ کانگریس کی تائید اور تقلید (بقیہ صفحہ ۲۰۶ پر)

صدر استقبالیہ تھے جن کا خطبہ گورنمنٹ نے ضبط کر لیا۔

بہر حال پُرامن اور آئینی سیاست کے پلیٹ فارم پر علماء ملت کا یہ پہلا اجتماع

تھا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے کوئی موثر پروگرام

اُس وقت تک نہ کانگریس کے پاس تھا۔ نہ مسلم لیگ کے پاس۔ صرف عرضداشتیں

تھیں یا احتجاجات اور یہی سبب تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کا اجتماع ہوتا تھا۔

۱۹۱۹ء کے ابتدائی مہینے وہ ہیں جن میں ستیہ گرہ کا پروگرام دریافت

کیا گیا اور ملک کو اس پہ چلنے کی دعوت دی گئی۔

لیکن اس وقت ستیہ گرہ کا منشا محض رولٹ ایکٹ کا مقابلہ تھا البتہ اس

کے بعد مفکرین ہند نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ آزادئ ہند کو ایک اقتصادی تقاضہ

قرار دیکر ہندوستان کی سیاست کو تمام دنیا کی سیاست کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اور

ایک بعید منزل کے لئے ترک موالات اور ستیہ گرہ کو حصول مطالبات کا پروگرام مقرر

کر لیا۔

(بقیہ حاشیہ صہ ۲۰۵)

ہر معاملہ میں کی جارہی تھی مسلمانوں کے لیڈر لیگ سے الگ ہو کر خلافت اور جمعیۃ العلماء کے پلیٹ

فارم پر دکھائی دیتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ہندو مسلمانوں میں بے انتہا اتحاد و اتفاق پیدا

ہو گیا تھا۔ (تاریخ مسلم لیگ صہ ۱۷۸)

جمعیۃ علماء ہند کا قیام

۱۹۱۹ء پہلا سال ہے جس میں پُر امن جدو جہد کا آغاز ہوا۔ انقلاب اور حریت کے متعلق جو مشورے خفیہ ہوا کرتے تھے۔ اب اس کے لئے اجلاس منعقد کئے جانے لگے۔ تو علماء ملت جو ہمیشہ انقلاب کی راہ میں پیش پیش اور اپنے نصب العین میں انتہا پسند رہے۔ اس موقع پر بھی وہ پیش پیش تھے۔

وطنی مطالبات کے لئے انڈین نیشنل کانگریس تھی۔ جس میں زعمائے ہند نے شرکت کی۔

خلافت اسلامیہ سے متعلق مطالبات منوانے کے لئے اسی سال خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ تحفظ ملت اور سیاسیات میں مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے جمعیۃ علماء ہند قائم کی گئی۔ جس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو زیر صدارت مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی امرت سر میں ہوا۔

اس کے ساتھ ساتھ انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی۔ خلافت کمیٹی کا اجلاس زیر صدارت مولانا شوکت علی مرحوم اور مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم امرت سر میں ہوا قیام جمعیۃ کے وجوہ اور حالات حسب ذیل اقتباس سے معلوم ہوں گے۔ جو جمعیۃ کی روداد سے لیا گیا ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو جب دہلی میں خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس اس غرض

سے منعقد کیا گیا کہ اتحادیوں سے عموماً اور حکومت برطانیہ سے خصوصاً ان کے وعدوں کے ایفاء کا مطالبہ کیا جائے جو مسلمانوں سے جنگ عموی کے وقت کئے گئے تھے۔ تو خلافت کے اس جلسہ میں علمار نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ انھیں ایک رابطہ میں منسلک کیا جائے۔ جن کی اجتماعی قوت کو ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے بالکل منتشر کر دیا تھا۔

ہندوستان کی سیاست محض چاپلوسی خوشامد اور اظہار وفاداری پر محدود ہو چکی تھی۔ گویا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاست داں وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو حکومت متسلط کا سب سے بڑا وفادار ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علمار مذہب جو طبعاً خوشامد اور چاپلوسی سے متنفر ہیں اور جو بڑے بڑے بادشاہوں کے مقابلہ میں اعلار کلمۃ الحق کے عادی رہے ہیں۔ اس سیاست سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

نیز ۱۸۵۷ء میں علمار حق کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا اور جس بے دردی کے ساتھ علمار ہند کو پھانسی اور جلاوطنی کی وحشیانہ سزائیں دی گئی تھیں اس کا مقتضا قدرتاً یہ تھا کہ علما کو مجبوراً گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرنی پڑی۔

چونکہ مسلمانوں کی سیاست نے ۱۹۱۹ء میں پھر پلٹا کھایا اور خوشامد اور تملق کی پالیسی تبدیل ہوئی تو علمار ملت نے دوبارہ سیاسی میدان میں قدم رکھا اور جمعیۃ علمار ہند کا قیام کیا گیا۔ ع۵

۵ع بحوالہ روشن مستقبل ص۳۳)

سیدنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی

مالٹا سے رہائی اور ہندوستان میں تشریف آوری

ایک طویل تحریر کے بعد پھر موقع آیا ہے کہ سیدنا شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے حالات بیان کیے جائیں۔ گذشتہ تحریر کا منشا یہ تھا کہ حضرت شیخ کی اسارت کے چار سال میں ہندوستان کن حالات سے گذرا۔ تاکہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے اس مسلک کے دلائل بھی سامنے آجائیں جس کو حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے مالٹا سے واپسی پر اپنے لیے منتخب فرمایا اور پھر اسی پر کاربند ہونے کی عام مسلمانوں کو ہدایت فرمائی۔

رہائی ۲۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ اپنے رفقا کے ساتھ مالٹا سے سرکاری حفاظت میں روانہ کیے گئے۔ سرکاری نگرانی اور حفاظت ہی میں "سیدی بشر" میں اٹھارہ روز اور موسیں میں پونے دو ماہ قیام کرتے ہوئے ۲ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو یہ حضرات بمبئی میں ورود فرما ہوئے۔ اور اس وقت معلوم ہوا کہ وہ آزاد ہیں۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ ابھی جہاز ہی میں تھے کہ سرکاری مولوی "مولوی رحیم بخش" انگریزی ایجنٹ کی حیثیت سے حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دلائل اور براہین کے ساتھ خیرخواہانہ انداز میں درخواست کی کہ حضرت شیخ ہندوستان کے سیاسی جھگڑوں میں شرکت نہ فرمائیں۔ کمزوری کا

آخری زمانہ عافیت کے ساتھ یادِ خدا میں بسر فرمادیں۔ وغیرہ وغیرہ نیز یہ کہ بمبئی اترتے ہی مولانا دیوبند کو روانہ ہو جائیں۔ خلافت والوں کے ہاتھ نہ پڑیں مگر وہاں تو بقول شخصے

ع یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

آپ کا قلبی مذاق ہی سیاست تھا۔ مرض وفات کے زمانہ میں کئی مرتبہ فرمایا کہ اگر اس مرض سے اچھا ہو گیا تو اس تحریک کی اشاعت میں سارے ہندوستان میں دورہ کروں گا۔[1]

بہر حال خلافت کمیٹی بمبئی نے نہایت عظیم الشان استقبال کیا۔ ایڈریس پیش کیے۔ ۲۲، ۲۳، رمضان ۱۳۳۹ھ کو بمبئی میں قیام رہا۔ پھر وہاں سے روانہ ہو کر ۲۵ رمضان کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ پھر اتوار کی صبح کو روانہ ہو کر ۲۶ رمضان المبارک بوقت ۸ بجے صبح اسٹیشن دیوبند پر ورود فرمایا۔

راستہ میں اہل میرٹھ نے ایڈریس پیش کیا۔

راستہ کے اسٹیشنوں پر زائرین کا ہجوم تھا۔ دیوبند کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہجوم کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شہر اور دیہات کے لوگ زیارت کے لئے حاضر تھے۔

شیخ الہند کا خطاب | معلوم ہوا ہے کہ خلافت کمیٹی کے زعمانے یہ خطاب انتخاب کیا تھا جو اسم گرامی کا مقبول اور مشہور جزو بن گیا۔

قدوم مبارک کی برکت | حضرت شیخ وعظ اور تقریر کے عادی نہیں تھے لیکن انفاس قدسیہ اور خلوص نیت کی برکت تھی کہ برقی سرعت کے ساتھ تمام مسلمانوں

---

[1] سفر نامہ اسیر مالٹا ص ۱۲۰

کے دل و دماغ پر تحریک کا تسلط ہو گیا۔ اب تک علمار کرام اور زعمار ملت کی تقریریں بھی ہو رہی تھیں۔ وعظ، لکچر پروپاگنڈے تقسیم سلطنت عثمانیہ پر نوحہ۔ بکار، اجلاس اور جلوس سب کچھ تھے۔ جلیانوالہ باغ کا اشتعال انگیز حادثہ بھی پیش آچکا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے قلوب گویا کسی اطمینان کے طالب تھے۔ حضرت شیخ کی تشریف آوری نے اس طلب کو پورا کر دیا۔ اور اب مسلمان کا قدم سب سے تیز تھا۔ ہر ایک شخص تحریک کا متوالا۔ جان اور مال کو قربان کرنے کے لئے آمادہ۔

ایک تھوڑی تعداد جو مخالف تھی اس کی حالت یہ تھی کہ جب دہلی میں اس گروہ کے بہت بڑے شخص کا انتقال ہوا تو باوجودیکہ وہ پہلے علمار نیز عام مسلمانوں میں بہت زیادہ رسوخ اور مقبولیت رکھتا تھا لیکن اس وقت حالت یہ تھی کہ تجہیز و تکفین کے لئے مسلمان تیار نہ تھے۔ گھر کے مخصوص آدمیوں کے سوا کوئی شخص شریک جنازہ نہیں ہوا۔ مجبوراً جنازہ کو موٹر میں قبرستان پہنچایا گیا۔ (معاذ اللہ)

شیخ الہند در حقیقت اس وقت شیخ الہند تھے۔ پورے ہندوستان کے مسلمہ قائد آپ ہی تھے۔ حضرت شیخ الہند ہی کی برکت تھی کہ آپ کی پارٹی کے افراد ہندوستان کے مسلمہ لیڈر تسلیم کئے گئے۔ اور اسی کا اثر تھا کہ گاندھی جی بھی اعتراف کیا کرتے تھے کہ میں مولانا محمد علی کی جھولی کا ایک مہرہ ہوں۔

ایک خاص برکت۔ جس کے دوبارہ مشاہدہ کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔ اور بظاہر ترستی رہیں گی۔ یہ تھی کہ شہر اور دیہات کے تقریباً تمام ہی مسلمان نمازی بن گئے۔ ضلع سہارنپور کے دیہات کی یہ حالت تھی کہ پنج وقتہ نمازیوں کی

کثرت سے مسجدوں میں جگہ ملنی مشکل ہوتی تھی۔

سیہ بختی مسلم بلاشبہ حضرت شیخ الہند کی تشریف آوری پر مسلمانوں کا شیرازہ اس طرح فراہم ہوا تھا کہ توقع ہوتی تھی کہ اب ان کے اقبال کا تارہ گردش سے نکل چکا۔ لیکن افسوس ؎

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو مرض الوفات کا آغاز تھا۔ آپ کو وجع المفاصل کا قدیم سے عارضہ تھا۔ کثرت بول کی شکایت بھی پرانی تھی۔ اس پر مالٹا کا سرد موسم اور مزید براں حضرت والا کی شب بیداری۔ ریاضت اور قلت غذا۔ بایں ہمہ پیرانہ سالی۔ اور پھر ترکوں کی شکست اور جدوجہد کی ناکامی کا صدمہ۔

ان تمام اسباب کی بناپر گویا مرض کا سلسلہ مالٹا ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ پھر تقریباً تین ماہ تک راستہ کی مشقت اور ہندوستان پہنچنے کے بعد ملاقات کا ہجوم۔ تحریک کی ترقی۔ مشاغل کی کثرت۔ یہ سب چیزیں اضافہ مرض کا سبب بنتی رہیں انتہا یہ کہ آپ کو دق ہوگئی۔ مگر درحقیقت اس شیخ طریقت اور شیخ سیاست کی کی ہمت و استقلال۔ ہر ایک مسلمان بلکہ ہر ایک انسان کے لئے سبق آموز ہے کہ تپ دق کا آخری اسٹیج ہے۔ چلنا پھرنا تو درکنار۔ بیٹھنا بھی ممکن نہیں۔ مگر اسی حالت میں تحریک کی قیادت جاری ہے۔ اجلاسوں کی شرکت کے لئے سفر ہو رہا ہے۔ صدارت فرمائی جارہی ہے۔

العظمۃ للہ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ بستر مرگ پر ایک شیخ فانی کا

یہ بے پناہ جذبۂ عمل۔

مسلم نیشنل یونیورسٹی کا قیام اور حضرت شیخ الہند کی صدارت

اسی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے طلبہ نے یونیورسٹی کا بائیکاٹ کیا۔ اور ایک دوسری یونیورسٹی (مسلم نیشنل یونیورسٹی) قائم کرنی چاہی۔ حضرت شیخ الہند کو صدارت کے لیے منتخب کیا۔ حضرت شیخ الہند کی بیماری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ کروٹ بدلنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ خدام نے اس حالت میں سفر اور پھر صدارت کو بہت زیادہ خطرناک تصور کیا اور اصرار کے ساتھ حضرت شیخ کو منظوری صدارت سے منع کرنا چاہا۔ لیکن حضرت شیخ کا جواب یہ تھا۔ "اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔"

چنانچہ پالکی میں لٹا کر حضرت شیخ کو دیوبند کے اسٹیشن پر لے گئے دارالعلوم دیوبند کے طلبہ نے پالکی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا۔

یہ اجلاس ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڈھ میں ہوا۔ حضرت شیخ کا خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ خطبۂ صدارت کے مندرجہ ذیل فقرے خاص طور پر یادگار ہیں۔

(۱) میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب اُن سے کہا جاتا

ہے کہ خدارا جلد اُٹھو۔ اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف وہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا۔

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

(۲) اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم "علی گڈھ" کی طرف بڑھایا۔ اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں "دیو بند اور علی گڈھ" کا رشتہ جوڑا۔

(۳) آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہونگے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں۔ یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔

(۴) ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اگر طلبہ اپنے مذہب کے

اصول وفروع سے بےخبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنی قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائیگا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

اجلاس دوم جمعیۃ علماء ہند کی صدارت

۷، ۸، ۹، ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹، ۲۰، ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا جو اپنے مقاصد کے اعتبار سے نہایت اہم تھا۔

حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے۔ مگر علماء ملت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ العلماء حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کرلے جن پر کاربند ہو کر اپنے فرائض سے سبک دوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔

حضرت شیخ کا خطبۂ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر علماء ملت اور ملی سیاست کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔

حضرت شیخ کے اس خطبۂ صدارت نے علماء ملت کو مندرجہ ذیل اصولی نظریات کی ہدایت فرمائی۔

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترک

موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

(۳) استخلاص وطن کے لئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

(۴) اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لئے جائز ہو سکتا ہے (باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں) تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔ (صفحہ ۱۶ خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس کے چند جملے بلفظہٖ درج ذیل ہیں۔

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ہموطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں۔ اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن

بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو۔ ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔ ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کر لیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اُن سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے۔

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری یہ گزارش دونوں قوموں کے زعماء لیڈروں سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں

کی کثرت اور ریزولیوشنوں کی زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔

اگر فرض کرو۔ ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں۔ اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

(صہ۱۸ خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

آپ نے مسلمانان ہند اور علماء ملت کو وصیت فرمائی۔

جو صراط مستقیم آپ نے معلوم کرلیا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جایئے۔ اور یمین و شمال کی طرف مطلق التفات نہ کیجئے۔

ان هذا صراطی مستقیماً فاتبعوه۔ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله[1]۔ جو لوگ آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور مواعظ حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجئے اور اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو "بالتی هی احسن"[2] ہونی چاہئے

صفحہ ۱۱ خطبہ صدارت)

---

[1] بے شک یہ ہے میرا سیدھا راستہ تم اس پر چلتے رہو اور دوسرے راستوں پر مت چلو کہ یہ راستے تم کو سیدھے راستے سے جدا کردیں گے ۱۲ [2] ایسی طرح سے جو بہت ہی بہتر ہو۔ یہ بات خیال رکھنے کی ہے کہ علماء تفسیر کی تحقیق کے بموجب یہ حکم اس وقت ہے جب اسلحہ کے ذریعہ سے جہاد ممکن نہ ہو یا مصلحت کے خلاف ہو۔ کیا عدم تشدد کی پالیسی کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے۔

اراکین جمعیۃ علماء ہند کو معاذ اللہ ہندو پرست کہنے والے حضرات غور فرمائیں کہ شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متعلق ان کا کیا فیصلہ ہوگا۔

اور اگر آج موجودہ علماء سے کسی پُر تشدد جدو جہد کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو کیا حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی مبارک عمر کے پچاس سال انقلابی جدو جہد پر صرف نہیں کئے تھے۔

یہ وہی مولانا محمود الحسن ہیں جنہوں نے ۱۲۹۷ھ میں دار العلوم دیوبند میں ثمرۃ التربیت قائم فرما کر نصف صدی انقلابی جدو جہد میں صرف کی۔ اور آج ۴۲ سال بعد مسلمانوں کو ایک مشترکہ اور آئینی جدو جہد کی ہدایت فرما رہے ہیں۔ کیوں ———— ؟ جوابات پہلے گذر چکے۔

جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد اسی دوران میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا جو اس نظریہ کے بموجب قائم کیا گیا تھا کہ علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایسی آزاد درسگاہ ہو جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثرات سے بالکل آزاد ہو اور جس کا تمامتر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔[۱]

رحلت جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سے صرف ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء بروز منگل اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

---

[۱] خطبہ صدارت حضرت شیخ الہندؒ

اعزا و اقارب کے اصرار پر جنازہ دیوبند لایا گیا۔ خلقت کا بے انتہا ہجوم تھا۔ دو جگہ دہلی میں۔ پھر میرٹھ اور مظفر نگر کے اسٹیشن پر اور آخر میں دیوبند میں جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔

مولانا محمد علی صاحب نے روتے ہوئے فرمایا۔ آپ کی وفات نے کمر توڑ دی۔

ھٰذا ما تسنیّ لی من سیرتہ۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ جمیع الانبیاءِ والمرسلین۔ وعبادہ الصالحین المقربین

حضرت علامہ غازی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

(و)

حضرت علامہ غازی مولانا محمد میاں صاحب انصاری

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے ساتھ ان دونوں انقلابی بزرگوں کے مختصر حالات بھی درج کر دیئے جائیں جن سے حضرت شیخ الہند کی تحریک پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت علامہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی خود نوشت

۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو حضرت سندھی صاحب جلاوطنی سے نجات پا کر کراچی تشریف لائے وزارت سندھ جس نے آپ کی رہائی کے لئے جدوجہد کی تھی۔ تشریف آوری کے وقت استقبال کا انتظام کر رہی تھی۔ خود اللہ بخش صاحب وزیر اعظم صوبہ سندھ مجمع کے آگے آگے جہاز کی گودی پر موجود تھے۔ اخبارات نے آپ کے متعلق مختلف بیانات شائع کرنے شروع کر دیئے۔ تو حضرت موصوف نے اپنی سرگذشت خود مرتب فرما کر اخبارات کو بھیجی تھی۔ یہ سرگذشت درج ذیل ہے۔

میرا خاندان اور مولد میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری ہے۔ لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا۔ اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے

میں عموماً حضرت سلمان فارسی کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام رکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والدہ کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبیداللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی"[1] تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبیداللہ بن رامائن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرا دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کا کاردار تھا۔

پیدائش اور یتیمی میں بشب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔

میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم اُن کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۶ء سے جام پور کے اردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مڈل اسکول کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لئے گھر چھوڑ دیا۔

اس دوران میں دو سال کے لئے سیالکوٹ میں رہا۔ اس لیے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ ورنہ اسکول میں شروع میں ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

---

[1] جیونی کی عربی عائشہ۔

مطالعہ اسلام

۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماجی لڑکے سے "تحفۃ الہند" ملی۔ میں اس کے مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلان) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انھیں کے توسط سے مجھے مولانا محمد اسماعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور بُرائنک شرک اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھنوی کی کتاب احوال الآخرت پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی۔ اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبید اللہ خود تجویز کر لیا۔

احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں۔ یہی دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں، ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لئے جاؤں گا اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

اظہار اسلام

۵/۶ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ میں نکل کھڑا ہوا میرے ساتھ کوٹلہ مغلان کا ایک رفیق عبد القادر تھا۔ عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ "کوٹلہ رحم شاہ" ضلع مظفر گڈھ میں پہنچے۔ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزا تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اس طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سیّد العارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی۔ اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھرچونڈی والی) کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لئے اسی طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابوالحسن امروٹی جن کا ذکر آگے آئے گا۔ اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبیداللہ نے اللہ کے لئے ہم کو اپنا باپ بنایا۔ اس کلمۂ مبارکہ کی تاثیر خاص میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور اسی لئے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لئے رخصت ہوا مجھے بتایا گیا کہ حضرت نے میرے لئے دعا فرمائی "خدا کرے عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے"۔

میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی۔ اور اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

سیّد العارفین کے خلیفہ

بھرچونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بھاولپور کی دیہاتی مسجد میں ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھتا رہا اس نقل و حرکت میں "دین پور" پہنچا۔ جہاں سید العارفین کے خلیفۂ اول مولانا

ابوالسراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولانا عبدالقادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا اور وہ آگئی۔ اور واپس جانے کے لئے بہت زور لگایا۔ مگر بحمداللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی) شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل جانور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا۔ اور مولوی خدابخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نووارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اسٹیشن مظفر گڈھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دارالعلوم دیوبند صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دارالعلوم میں داخل ہوا۔ تقریباً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ سے اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھیں۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا۔ اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لیئے چند ماہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا۔ اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رامپور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں اسی طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ دیوبند میں دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہند کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ۔ تلویح۔ مطول، شرح عقائد مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا۔

چند دوستوں نے مبشراً خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔

رمضان شریف میں اصولِ فقہ کا ایک رسالہ لکھا جسے حضرت شیخ الہند نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جہاں جمہور اہل علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں بلکہ راسخین فی العلم وہبی علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورہ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی حضرت مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابوداؤد کے لیئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

شاہ جہاں آباد دہلی | بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے افاقہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کریں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی ہیں اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب و حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنار قیام دہلی میں دو دفعہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب کی زیارت کے لیے گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی کے دو سبق بھی سُنے۔

معاودت سندھ | ۲۰ رجمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا۔

میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب

۱۳۰۸ھ میں حضرت شیخ الہند نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا۔ اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابوداؤد پڑھی۔

سید العارفین کے دوسرے خلیفہ شوال ۱۳۰۸ھ سے سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن صاحب تاج محمود کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ میرے لئے بمنزلہ باپ تھے۔

میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔

میری والدہ کو بلایا وہ میرے پاس آخر وقت تک اپنے طرز پر رہی۔ میرے مطالعہ کے لئے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظلِ عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک باطمینان مطالعہ کرتا رہا۔

کتب خانہ پیر صاحبُ العلم گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علومِ دینیہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ میں دورانِ مطالعہ وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا۔ میری تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کا بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر "صاحب العلم" کی صحبت اس کے علاوہ حضرت مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انھیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔

حضرت مولانا ابو التراب رشد اللہ "صاحب العلم الرابع" سے علمی صحبتیں

رہیں وہ علمِ حدیث کے جید عالم اور صاحبِ تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز | اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمتِ عظمیٰ جس کا شکریہ میں ادا نہیں کر سکتا یہ ہے کہ فقہ وحدیث کی تحقیق سے تطبیق میں اور ایسا ہی قرآنِ عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کر کے امام ولی اللہ دہلوی تک سلسلۂ علماء میرا رہبر بنا اور میں نے ان کو اپنا امام بنا لیا۔

مجھے اپنی علمی اور سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سلسلے میں میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہو گئیں اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح سے پیوستہ ہو گئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف مولانا شیخ الہند نے کرایا تھا۔ آخر میں اسی کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علماء کی ایک جماعت کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد حضرت شیخ الہند سے پڑھی۔

طریقۂ قادریہ | اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال و اذکار کی بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے خلیفۂ اعظم مولانا ابو السراج دین پوری سے سیکھتا رہا۔ اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کر لیتا۔ اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

میرا سیاسی میلان | دورانِ مطالعہ میں مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی

اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوطِ دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا پہلے جو کچھ لاہور کے لئے سوچتا تھا اب دہلی کے لئے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا سیاسی مختصر پروگرام بنالیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اپنے خیالات کے مطابق آہستہ آہستہ کام شروع ہوا۔

معاودت دیوبند | میں ۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفہاً (حاضر خدمت ہو کر) اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا ذکر آگیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اس کو اتحاد اسلام کی ایک کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے وابستہ رہے۔

دار الرشاد گوٹھ پیر جھنڈا امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا۔ اور دو سال تک چلایا۔ بعض نایاب عربی اور سندھی کتابیں طبع ہوئیں۔ اسکے بعد ایک ماہوار رسالہ "ہدایت الاخوان" چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لئے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانیکا ارادہ کیا اس کا نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہوا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن الیمانی امتحان کے لئے تشریف لائے اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی۔ اور امام مالک کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند ۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سنکر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا۔ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا اس جمعیۃ کی تحریک و تاسیس میں حضرت مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد صاحب لاہوری اور عزیز مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستی میں

حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح پر شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے چار سال میں دیوبند رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیجکر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے۔ اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے انھوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتلا سکے

کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہے۔ اس میں میرے جیسے خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی

کام کرتا رہا۔

۱۹۱۶ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔

سیاحتِ روس ۱۹۲۲ء میں ترکی جانا ہوا۔ سات مہینے ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ اس لئے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا۔ اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔)

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانہ کی لادینی کے حملہ سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان

رفقار جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ سوشلسٹ بھی ہیں اور نیشنلسٹ بھی۔ سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ہمیشہ ممنون رہا۔ اور شکر گذار ہوں گا۔ اگر ان تینوں طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کرسکتا۔ فللہ الحمد وحدہٗ۔

نئی ترکیا ۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لیے سفیر ترکیہ متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا۔ اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہیں لگا سکے۔ (یہ غلط ہے کہ میں استنبول میں اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے) تقریباً تین سال میں ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا ہے مجھے مستقبل قریب میں اس کیلئے کوئی مرکز نظر نہ آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا۔ جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہنا رہا ہوں۔ اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرنے کے لیئے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہ پڑھ لیا اجازت نہیں دی۔ بعض ہندوستانی اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت

کے لیئے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلہ اذکار رہا۔ اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں۔ نہ اس کا اچھا بدل تبلا سکتے ہیں۔ اور کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار سال پہلے زمانہ میں لیجا کر کھڑا کر دیں البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے۔ وہ میرے لئے باعثِ سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔ لیکن اس بنا پر پولٹیکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلائی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا ہے[1]۔ کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا فھو حق بھا

مکہ معظمہ پہنچنا ۱۳۴۴ھ میں موسم حج پر مکہ معظمہ میں موتمر خلافت منعقد ہوئی میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستہ سے مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر میں موتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ میں یہاں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس وجہ سے ایک طرح میں محفوظ ہو گیا۔

---

[1] یعنی ہجرت سے پیشتر مکہ معظمہ میں اور ایک سال تک مدینہ طیبہ میں واللہ اعلم بالصواب

اگر کبھی جمنڈی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اُسے پورا کر دیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیاء امور حارج نہیں ہوئے۔ اس لیے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جزاہم اللہ خیراً۔

علماء مکہ سے استفادہ مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی و حاجی علی جان دہلی والے۔ دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی مرحوم۔ تیسرے ابو الشرف مجددی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ دارالحدیث مکہ اور شیخ ابو السمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ میں یقیناً ۱۳-۱۴ سال سے قرآنِ عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآنِ عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے اس زمانہ میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حاصل کر سکا جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔

لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک اعلیٰ نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننی پڑتی ہے۔

میں نے امام ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدور بازغہ۔ خیر کثیر۔ تفہیمات الٰہیہ۔ سطعات - الطاف القدس

لمعات وغیرہ۔

ان کی کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذغان اور مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات اور مولانا محمد قاسم کی قبلہ نما تقریر دلپذیر اور آب حیات کا استعمال کیا۔

مراجعت وطن | ۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی۔ اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۶ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔

جبال الصولتیہ بلدۃ الحرام۔ عبید اللہ[1]

حضرت علامہ مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری

آپ کا دولت خانہ قصبہ انبیٹھہ۔ ضلع سہارنپور ہے۔ آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند کے حقیقی نواسے ہیں۔ آپ کے والد ماجد مولانا عبداللہ صاحب انصاری تھے۔ جو علی گڈھ میں شعبۂ تعلیمات کے ناظم رہے۔ آپ نے دیوبند میں تعلیم پائی۔ اور پھر حضرت شیخ الہند کے فیض صحبت نے آپ کو اسلام کا جانباز مجاہد بنا دیا۔

---

[1] ۱۳ رمضان ۱۳۶۳ھ، ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو دین پور شریف ریاست بھاولپور میں بہتر سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ وہیں مدفن پاک ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

آپ کی جلیل القدر خدمات کی فہرست

(۱) جمیعۃ الانصار دیوبند کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ اس کے ناظم حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی تھے اور نائب ناظم آپ تھے۔

(۲) مدرسہ عالیہ دیوبند کو "دار العلوم" بنانے میں سرگرم حصہ لیا۔

(۳) دار العلوم معینیہ اجمیر شریف میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔

(۴) حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی رفاقت میں حجاز کا سفر کیا

(۵) ۱۹۱۴ء میں افغانستان کی طرف ہجرت کی اور آزاد قبائل کو ایک تعلیمی اسکیم کے ذریعہ سے بیدار کرنے اور ایک وفاق پر جمع کرنے کی کوشش کی۔

(۶) بخارا کے انقلاب میں اسلامی رجحانات کے مطابق حصہ لیا۔ اور انور پاشا کی تحریک کو قوت پہنچائی۔

(۷) افغانستان کی پہلی خفیہ صدارت فوق العادت متعینہ ترکیہ میں "وزیر مختار" مقرر کیے گئے۔ اور اپنے رفیق سفارت سردار محمد گل موجودہ وزیر داخلہ افغانستان کے ہمراہ روسی حدود میں گرفتار ہوئے۔ تین ماہ سوویٹ روس کی قید میں رہے اور بمشکل جان بچا سکے۔ جیل سے رہا ہو کر ماسکو گئے۔ جہاں پر زور استقبال ہوا۔ اور افغانی سفارت فوق العادت متعینہ ماسکو میں مشیر کی حیثیت سے شریک رہے۔ اس سفارت کے سکرٹری افغانستان کے مشہور وزیر خارجہ علامہ سردار فیض محمد خاں تھے۔

(۸) جنگ عظیم کے بعد نوجوان ترکوں کی حکومت کے صدر مقام انگورہ بھیجے گئے اور افغانستان کی سفارت میں رکن اعلیٰ مقرر کیے گئے۔

(۹) سمرنا کی فتح کے وقت افغانستان کے وزیر مختار کی حیثیت سے جشن فتح منعقدہ انگورہ میں سرکاری طور پر تقریر کی۔

(۱۰) انگورہ سے واپس ہوکر افغانستان اور ترکوں کے درمیان کُریر (شاہی قاصد) کے عہدے پر مقرر ہوئے اور وزارتِ خارجہ کے شعبہ مشرقی کے ماتحت سیاسی خدمات انجام دیتے رہے۔

(۱۱) سیاسی کشاکش نے آخر میں آپ کو گوشہ نشین بنا دیا۔ اس دور میں آپ نے اسلامی اجتماعات کی تلقین اور کتابی صورت میں تدوین و تصنیف شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ آپ کی گرانقدر تصانیف ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل رسائل طبع ہو چکے ہیں۔

(۱) حکومت الٰہی۔ (۲) احساس انقلاب یا مراقبۂ نماز (۳) مجمل بیعت تابعیت یعنی سورۂ فاتحہ کی مجمل سیاسی تفسیر (۴) دستور امامت امت (۵) انواع الدول[1]۔

افسوس ۶ر صفر ۱۳۶۵ھ ۱۱ر جنوری ۱۹۴۶ء یوم جمعہ کو ۳۲ سال کی غربت کے بعد آپ نے کابل میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ ونور مرقدہ۔ آپ کے پس ماندگان میں آپ کے خلف رشید مولانا حامد الانصاری غازی۔ مدیر اخبار مدینہ بجنور کی شخصیت طبقہ علماء میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] یہ کتاب اردو ترجمہ (اقسام حکومت) کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

اکابر دار العلوم دیوبند کا چوتھا طبقہ

از ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۰ء تا ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء

اکابر۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب۔ فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ امام العصر سیدنا حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب سیدی حضرت مولانا حافظ عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دار العلوم دیوبند

اس طبقہ کا آغاز ۱۳۳۹ھ سے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسی سنہ میں طبقہ سوم کا اختتام قرار دیا تھا۔ اگرچہ اس طبقہ کے اکابر کی خدمات بہت پہلے سے شروع ہیں جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب صدر مہتمم دار العلوم دیوبند

آپ حجۃ الاسلام سیدنا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دار العلوم دیوبند کے خلف رشید تھے۔ ۱۳۱۲ھ میں آپ دار العلوم دیوبند کے مہتمم قرار دیئے گئے۔

آپ ستودہ صفات پاکباز عالم تھے۔ آپ کو خداوند عالم نے ایک دولتِ عظمیٰ عنایت فرمائی تھی۔ جس کے اعتبار سے آپ کو اپنے وقت کا سب سے خوش نصیب کہا جا سکتا ہے۔

خداوند عالم نے آپ کو فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی کی رفاقت اور اس درجہ خلت عطا فرمائی تھی جس کی نظیر دنیا کی

تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ بہت کوششیں کی گئیں کہ اس باہمی موانست میں فرق پیدا ہو مگر وہ ایسا مضبوط رابطہ تھا جس میں کسی وقت کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ کا دورِ اہتمام دارالعلوم کے لیے مبارک و مسعود تھا۔

جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۳۱۲ھ میں مدرسہ کی آمد و صرف کا اوسط سات ہزار تھا۔ اور طلبہ کی کل تعداد ۲۹۳ لیکن وفات کے سال یہ اوسط اننی ہزار سے متجاوز ہو چکا تھا۔ اور طلبہ کی کل تعداد چھ سو سے زائد تھی۔

بے شک ہم حضرت موصوف کی کوئی سیاسی خدمت شمار نہیں کرا سکتے لیکن اگر تقسیم کار کا اصول قابل قدر ہے تو اس میں شک نہیں کہ سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے اگر درسی اور سیاسی خدمات کے لیے اپنی ذاتِ گرامی کو قربان کر دیا تھا تو آپ نے دارالعلوم کی مالی ترقیات کے لیے ہمیشہ اپنی ہستی کو وقف کئے رکھا۔

آپ اہتمام کے ساتھ تدریس اور وعظ کی خدمات بھی انجام دیتے تھے ۱۳۴۱ھ تا ۱۳۴۴ھ آپ ریاست حیدر آباد میں عدالت العالیہ (ہائیکورٹ) کے مفتیٔ اعظم رہے۔

آپ کو شمس العلما کا خطاب دیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں آپ نے خطاب واپس کر دیا۔

فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب | خلف الرشید حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب عثمانی دیوبندی۔ آپ ایک متبحر عالم اور عربی کے بہترین ادیب تھے۔ آپ کا تدبر

سیاست ۔ فراست بحر انتظام ۔ دور اندیشی اور دور بینی آج تک ضرب المثل ہے ۔ اور تاریخ دیوبند میں ہمیشہ بے نظیر سمجھی جاوے گی ۔

دارالعلوم کی حیرت انگیز ترقی میں جس طرح روحانی امور کو دخل ہے بلاشبہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی خداداد صفات کو بھی بہت زیادہ دخل ہے ۔

آپ نحیف الجثہ اور کمزور تھے ۔ غذا بہت تھوڑی ۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت آپ کو عطا کی گئی تھی ۔

امور اہتمام میں شب و روز انہماک کے باوجود کتب بینی کے شوق نے آپ کے مطالعہ کو بہت وسیع کر دیا تھا ۔

آپ کی علمی یادگاریں آپ کے عربی قصائد اور دیگر تصنیفات ہیں جن میں مندرجہ ذیل تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

(۱) حاشیہ مقامات حریری جو حل لغات کے ساتھ پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوا ۔

(۲) قصیدہ لامیۃ المعجزات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے ۔ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سو معجزات نہایت فصیح اور بلیغ انداز میں جمع کئے گئے ہیں ۔

استاذ محترم حضرت الحاج مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الفقہ دارالعلوم دیوبند نے ان کی اردو میں شرح کی ہے ۔

اس کے مطالعہ سے آپ کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

(۳) "اشاعت الاسلام" دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔ آپ کی تاریخ دانی کی ایک مثال ہے۔ یہ کتاب تقریباً پانچسو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ان تاریخی وجوہات کو ذکر کیا گیا ہے جو دنیا میں اشاعت اسلام کا سبب ہوئیں۔

(۴) تعلیمات اسلام۔ اس کتاب میں اسلام کے طرز حکومت کو بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ شورہ کو خلیفہ اسلام کے لئے کتنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس بارہ میں آپ کا آخری فیصلہ بجنسہ پہلے گذر چکا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر خلیفہ کی ذات پر کلی اعتماد ہو تو اکثریت اور اقلیت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں رہتی لیکن اگر امیر کو یہ اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سیاست میں بھی آپ کو اتنا ہی شغف ہوتا جتنا دار العلوم دیوبند سے تھا۔ تو آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی لیڈر مانا جاتا۔

تاہم میدان سیاست آپ سے محروم نہیں رہا۔ جمعیۃ العلماء کے آپ بہترین مشیر رہے۔ اور ۱۹۲۲ء؁ میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ گیا کے آپ صدر تھے۔ آپ کا خطبہ صدارت بہت مقبول ہوا۔ ع؂

ع؂ یہ اجلاس گیا میں ۲۲ دسمبر ۱۹۲۱ء؁ کو ہوا تھا۔ ع؂ حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کے گیارہویں اجلاس منعقدہ دہلی میں ایک تقریر کے ضمن میں فرمایا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے وصیت فرمائی تھی کہ ارکان جمعیۃ العلماء کو دو آدمیوں کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ایک مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دوسرے حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند۔

آپ کے آخری دور میں آئندہ کے لئے اہتمام کی بحث پیدا ہوئی۔ آپ کا خیال تھا کہ آیندہ مہتمم مولانا محمد طیب صاحب خلف حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ہوں۔ دوسرے حضرات اس کے مخالف تھے۔ نتیجہ اگرچہ اس کے موافق ہی رہا۔ مگر جماعت میں تفریق اور بدمزگی پیدا ہو گئی۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے کر علیحدہ ہو گئے اور ڈابھیل ضلع سورت میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھ دی۔ یہ تفریق اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے لئے عارضی طور پر مضر ہوئی۔ مگر احاطہ بمبئی جیسے علم سے خالی علاقہ میں ایک بہت بڑے مدرسہ کی بنیاد پڑ گئی۔ جو ایک برکت تھی۔

آپ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہمیشہ دست راست بلکہ مختار مطلق رہے اور حضرت حافظ صاحب موصوف کے زمانہ کی دارالعلوم دیوبند کی ترقی درحقیقت آپ کی رفاقت کی ہی برکت ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے دور میں دارالعلوم کی ترقیات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف تعمیرات اور کتب خانہ کے سلسلہ میں تقریباً آٹھ لاکھ کی مالیت کا اضافہ ہوا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم قرار دیئے گئے۔

رجب ۱۳۴۶ھ میں آپ نے اس جہان فانی سے ہجرت فرمائی اور ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کو محتاج چھوڑا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ۔

امام العصر سیّدنا حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری

خاکسار حضرتِ موصوف کا ایک ادنیٰ تلمیذ ہے۔ حضرت والا کی جلالتِ شان، احقر کے قلم کو مرعوب کر رہی ہے۔ خوش قسمتی سے آپ کے صاحبزادہ سید اظہر شاہ صاحب "قیصر" نے بروقت احقر کی امداد فرمائی اور خود اپنے قلم سے حضرتِ موصوف کے حالات قلم بند فرما دیئے۔ جو صاحبزادہ کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ جزاهم الله احسن الجزا۔

حضرت علامہ جلیل رحمۃ اللہ علیہ ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ بوقت صبح اپنے ننہیال میں بمقام موضع دودھواں (علاقہ لولاب کشمیر) میں پیدا ہوئے ۴½ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد معظم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآنِ پاک شروع کیا اور چھ برس کی عمر تک قرآن پاک کے علاوہ فارسی کے متعدد رسائل بھی ختم کر لیے۔ پھر مولانا غلام محمد صاحب (صوفی پورہ) سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی اور ابھی آپ کی عمر ۱۳-۱۴ سال کی تھی کہ ۱۳۰۵ھ میں شوق تعلیم نے لولاب کے مرغزاروں اور سبزہ زاروں پر غریب الوطنی کی علمی زندگی کو ترجیح دی۔

چنانچہ تین سال تک آپ ضلع ہزارہ (سرحد) کے متعدد علماو صلحاء کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے۔ پھر جب علوم وفنون کی پیاس وہاں بھی بجھتی نظر نہ آئی تو ہندوستان کے مرکز علوم دینیہ

دارالعلوم کی شہرت سنکر آپ بھی ۱۳۰۷ھ یا ۱۳۰۸ھ میں بعمر سولہ سترہ سال ہزارہ سے دیوبند آگئے۔ دیوبند میں آپ نے چار سال رہ کر وہاں کے مشاہیر وقت و یکتائے روزگار علما سے فیوض علمیہ و باطنیہ کا بدرجہ اتم استفادہ کیا اور ۲۰-۲۱ سال کی عمر میں نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سند فراغ حاصل کی۔ جن علمار سے آپ کو شرفِ تلمیذ رہا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

قدوۃ العلمار حضرت مولانا الحاج محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ۔ حضرت مولانا الحاج الحافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنی۔ حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی الدیوبندی۔ دیوبند سے فارغ ہو کر قطب الارشاد حضرت مولانا الحاج رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کیے۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے۔ اور تین چار سال تک مدرسہ امینیہ عربیہ کے مدرس اول رہے۔

دہلی میں بارہ تیرہ سال قیام کے بعد بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے باعث آپ کشمیر تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے سفر حجاز میں طرابلس۔ بصرہ اور مصر و شام کے جلیل القدر علمار نے آپ کی بہت عزت کی اور سب نے آپ کی خداداد و بے نظیر لیاقت و استعداد دیکھ کر

سندات حدیث عطا فرمائیں۔ جن میں آپ کا نام "الفاضل الشیخ محمد انور بن مولانا محمد معظم شاہ الکشمیری" لکھا گیا ہے۔

سفر حجاز سے واپس آکر خواجگان قصبہ بارہ مولا (کشمیر کا ایک مشہور مقام ہے) خصوصاً خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس اعظم کے اصرار پر آپ نے اسی قصبہ میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیض یاب فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کے مشہور جلسۂ دستار بندی میں مدعو کیا گیا۔ اور آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ دارالعلوم جہاں آپ نے استفادۂ علوم و فنون کیا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی تھی۔ اب اسی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہو گئے۔ سنن ابوداؤد شریف اور صحیح مسلم شریف کا درس سالہا سال تک آپ بغیر کسی تنخواہ کے دیتے رہے چند سال کے بعد آپ کو اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے پھر کشمیر جانا پڑا لیکن دارالعلوم کی طرف سے واپسی کا شدید تقاضا ہوا۔ اس لئے جلد ہی واپس تشریف لے آئے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے بہت زیادہ شفیق استاد تھے اور ساتھ ہی آپ کا بہت زیادہ احترام بھی فرماتے تھے وہ اکثر دیوبند میں آپ کے مستقل قیام کی تجاویز سوچا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اور پھر اتباعاً للسنۃ النبویہ نکاح کی تاکید فرمائی۔ یہ ۱۳۳۶ھ کا واقعہ ہے جب آپ کی عمر شریف ۴۴ سال تھی۔

بظاہر حضرت شاہ صاحب کو مجرد ہی رہنا بہت پسند تھا۔ اور آپ شادی کے لئے بالکل آمادہ نہ تھے۔ لیکن بسبب اتباع سنت نبوی اور اپنے مشفق و محترم استاد کے اصرار پر بادل ناخواستہ رضامندی ظاہر فرمائی۔ اور جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم کے حسن انتخاب سے گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک اعلیٰ اور معزز شریف خاندان میں آپ کی شادی ہوگئی۔ اس سے پہلے آپ دارالعلوم میں حسبۃً للہ درس دیتے تھے۔ اب شادی کے بعد بسبب حوائج اہل و عیال نہایت قلیل تنخواہ قبول فرمائی۔

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے سلسلہ میں آپ کو بیشتر ہندوستان کے اکثر مقامات میں جانا پڑا ہے اور جہاں جہاں آپ تشریف لے گئے ہیں وہاں سے دارالعلوم کی امداد و اعانت میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم کا وفد نواب خواجہ سر سلیم اللہ بہادر نواب آف ڈھاکہ کی خدمت میں گیا۔ حضرت شاہ صاحب رئیس الوفد تھے۔ اور آپ نے عربی زبان میں نواب صاحب کو نہایت فصیح و بلیغ ایڈریس دیا۔ جس سے نواب صاحب مرحوم پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ اور وفد مذکور نہایت کامیاب ہو کر واپس آیا۔ وھکذا۔

۱۳۴۶ھ تک آپ دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس و جانشین شیخ الہند درس حدیث دیتے رہے۔ اس کے بعد جب منتظمین دارالعلوم سے بعض اصلاحات کے سلسلہ میں اختلاف ہوا۔ تو آپ نے دارالعلوم سے قطع تعلق فرمالیا اور آپ قطب عالم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ۔ شیخ التفسیر

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ۔ حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی رح۔ مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی ۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی اور بہت سے علما اور کئی سو طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ ڈابھیل جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے ۔ اور ۱۳۵۱ھ تک آپ نے جامعہ میں درس حدیث کا مشغلہ جاری رکھا ۔ ۲ ر صفر المظفر ۱۳۵۲ھ کو شب کے آخری حصہ میں آپ نے دیوبند میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ اور کئی سال کی علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت فرما ہوئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

حضرت شاہ صاحب رح موجودہ سیاسی خلفشار میں جمعیۃ علماء ہند کے مسلک کے بہت بڑے حامی بہت بڑے حریت پسند برطانوی امپریلزم کے سخت دشمن اور ہندوستان میں دین قیم کو سربلند دیکھنے کے آرزومند تھے ۔ شروع سے آخر تک آپ جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کے رکن اعلیٰ اور جمعیۃ کے مقاصد کے ہمدرد رہے ۔ ہمیشہ آپ نے اپنے گرانقدر مشوروں سے جمعیۃ کی رہنمائی اور جمعیۃ کے حلقے کو وسیع کرنے کی کوشش فرمائی ۔ ۱۳۴۶ھ میں حضرت مرحوم نے پشاور میں جمعیۃ کے آٹھویں عظیم الشان اور تاریخی سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے ایک بصیرت افروز اور معرکہ آرا خطبہ میں بہت سے مذہبی اور سیاسی موضوعات پر اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا تھا ۔ جمعیۃ کے علاوہ مجلس احرار کے حال پر بھی حضرت مرحوم کا گوشہ چشم التفات کے ساتھ مبذول رہا اور اس کے قائدین کی بھی حضرت مرحوم نے اپنے علم وفضل اور روحانی قوت سے قیادت ورہنمائی فرمائی ۔ تحریک کشمیر میں احرار کو حضرت مرحوم کی تمام

ہمدردیاں حاصل تھیں۔ علامہ مرحوم کو دورِ حاضر کے مہلک ترین فتنہ قادیانیت کے رد سے غیر معمولی شغف تھا۔ سالہا سال تک علامہ مرحوم اس فتنہ کی ہلاکت سامانیوں سے ملت مرحومہ کو محفوظ فرمانے کے لئے تحریری و تقریری طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ تردید قادیانیت کے سلسلہ میں آپ انتہائی پریشان کن علالت کی حالت میں بھی مذہبی جلسوں میں شرکت کے لیئے دور دراز کا سفر فرماتے تھے۔ انتہا یہ کہ انتقال کے صرف چند دن پہلے آپ اپنی مشہور و معرکہ آرا تصنیف "خاتم النبیین" سے فارغ ہوئے تھے۔ جس میں آیہ کریمہ ماکان محمد ابا احد من رجالکم و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین کی آپ نے اپنے مخصوص محدثانہ اور محققانہ انداز میں تفسیر فرمائی ہے۔ یہ تصنیف محض قادیانیوں کے دجل و تلبیس کے تار پود بکھیرنے کے لیئے فرمائی گئی تھی اس سے فراغت پاکر حضرت مرحوم نے اپنے خدام سے ارشاد فرمایا کہ۔

میں نے آخرت کے لیئے کچھ نہیں کیا تھا۔ خاتم النبیین کے عنوان سے یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ انشاء اللہ یہ مرزائے قادیان کے دجل و فریب کو اظہر من الشمس کر دیں گی اور میرے لیے زادِ راہِ آخرت ہوں گی۔"

مجلس احرار کو حضرت مرحوم نے ردِ قادیانیت پر متوجہ فرمایا۔ احرار نے اس فتنہ کے استیصال کے لیئے قابل قدر سرگرمی کے ساتھ جہاد کیا۔ اور اس کے ناپاک اثرات کو بہت حد تک ختم کر کے اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا واقفین حال اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہؒ کی برکات تھیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اسلامیات میں علامہ مرحوم سے بہت کچھ استفادہ کیا اور علامہ مرحوم کے فیض صحبت نے ان کی روح کو جلا بخشی ڈاکٹر موصوف دل و جان سے علامہ مرحوم کا احترام کرتے تھے اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ علامہ کی رائے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔

حضرت کے علمی و عملی کمالات میں سے جو چیز آپ کو اقران و اعیانِ عصر میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی وہ آپ کی جامعیت و تبحر علمی ہے۔ علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے جس میں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو۔ اور شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ علماء متقدمین میں بھی ہر حیثیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ و نقلیہ ہستیاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

آپ سیکڑوں علماء و فضلا کے مجمع میں بیٹھ کر ہر ایک علم و فن کے مسائل پر اس طرح تقریر فرمایا کرتے تھے کہ گویا آپ کو تمام مسائل فن مستحضر اور کالنقش فی الحجر ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ اپنے ارادہ سے کلام نہیں کر رہے ہیں بلکہ الہامات وارادات کے زور پر کہہ رہے ہیں اور یہ تو بیشتر ہوتا تھا کہ اکابر علماء وقت سے جب بعض دقیق ولاینحل یا مختلف فیہ مسائل کے متعلق پوچھا جاتا تھا تو وہ حضرت سے استفسار کرنے کو فرمایا کرتے تھے۔

اور اکثر علماء عصر حاضر کو جب کسی علمی مسئلہ میں کوئی دقت پیش آتی

تھی تو وہ خود بھی حضرتِ مرحوم سے مراجعت فرماتے تھے۔ ذیل میں حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی رح کے ایک مکتوب گرامی کا پہلا اور آخری حصہ مندرج ہے۔ جو انھوں نے حضرتِ مرحوم کو ارسال فرمایا تھا۔ جس میں انھوں نے کسی مسئلہ پر حضرتِ مرحوم سے تحقیق چاہی ہے۔

نفحۃ العنبر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی ایک طویل اور جامع تاریخ حیات ہے جسے عربی زبان میں حضرتِ مرحوم کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے مرتب اور مجلسِ علمی نے ڈابھیل سے شائع کیا ہے۔ نفحۃ العنبر کا بیان ہے کہ حکیم الامۃ نے اکثر مسائل میں علامہ مرحوم سے استفادہ کیا ہے۔

از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہ بخدمت بابرکت جامع الفضائل العلمیہ والعملیہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب دامت انوارہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تحقیق سابق کے متعلق بضرورت مکرر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا۔ اس کے متعلق جدا گانہ تکلیف دیتا ہوں الخ وقال فی خاتمہ اس میں روایتیا درایت سے کچھ حکم فرمائیں"۔

حضرت شاہ صاحب کا تبحرِ علمی و جامعیت فنون نہ صرف ہندوستان میں مسلم تھا بلکہ مصر و شام بیروت حرمین شریفین و دیگر بلاد اسلامیہ کے بھی جو علماء ہندوستان بغرض سیاحت آتے تھے اور دار العلوم میں پہنچکر آپ سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے تھے وہ آپ کی بے نظیر علمی قابلیت کے معترف ہو کر جایا کرتے تھے اور اکثر نے کہا کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا جامع و محقق

عالم نہیں۔

مصر کے مشہور عالم وادیب علامہ سید رشید رضا مدیر رسالہ "المنار" جو مفتی محمد عبدہ کے شاگرد رشید تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سالانہ جلسہ میں ہندوستان تشریف لائے۔ سید رشید رضا مرحوم دارالعلوم میں بھی آئے۔ اور آپ نے وہاں کا معائنہ کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے طلباء وارا کین مدرسہ وا عیانِ شہر کے جلسۂ عام میں اس موقع پر عربی زبان میں ایک مبسوط تقریر فرمائی۔ جس میں آپ نے اولاً دارالعلوم کی اجمالی تاریخ بیان فرمائی۔ پھر درس حدیث شریف کا جو طریقہ دارالعلوم دیوبند میں رائج تھا اس کو واضح فرمایا نیز حنفیہ کے مسلوک کو مستحکم دلائل کے ساتھ پیش فرمایا۔ اور اس کے اصول اساسی پر کافی روشنی ڈالی جس سے رشید رضا مرحوم بہت زیادہ محظوظ ہوئے اور حضرت شاہ صاحب کی قوت بیان اور استدلال اور وسعت معلومات پر سخت متحیر۔ نیز علامہ رشید رضا مرحوم نے شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے مذہب حنفی ہونے کے متعلق آپ سے بہت سے سوالات بھی کئے جن کا حضرت نے کافی وشافی جواب مرحمت فرمایا۔

سید رشید رضا علامۂ محترم کی ملاقات سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ آخر انہیں یہ کہنا پڑا۔ اگر میں دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھکو بتا دیا ہے کہ

ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی
اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں۔

علامہ موسیٰ جار اللہ روسی اسلامی دنیا کے زبردست عالم اور وسیع النظر فاضل ہیں۔ ان کی علمی شخصیت عالمگیر شہرت کی مالک ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء، سنہ ۱۹۳۱ء میں علامہ موسیٰ دیوبند تشریف لائے تھے۔ آپ کئی دن تک علامہ مرحوم سے علمی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے رہے اور اخیر میں آپ نے علامہ مرحوم کے تبحر علمی کا اعتراف فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا حافظہ زبان زد خلائق ہے۔ ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی تھے تو آپ کو یاد ہوتے تھے حوالہائے کتب صحیحہ بقید جلد و صفحات آپ کو ایک ہی دفعہ کے مطالعہ سے محفوظ ہو جاتے تھے اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے۔ احادیث کا تمام ذخیرہ اور ان کی صحت اور عدمِ صحت کے متعلق طویل و عریض بحثیں رواۃ کے مدارج و مراتب اس طرح محفوظ تھے کہ طلبہ حدیث اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک مکمل لائبریری کا کام لیتے اور ایسے سوالات کا جواب منٹوں میں حاصل کر لیتے جن کی تحقیق و جستجو کے لیے ایک پوری عمر درکار ہے۔ پھر ہر جواب میں جامعیت اس قدر ہوتی تھی کہ اس موضوع پر کسی کتاب کو خواہ وہ مطبوعہ ہو یا قلمی دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ مشہور و معروف کتاب خانوں کی اکثر مخطوطات (قلمی کتابیں) نظر سے گذر چکی تھیں اور اس طرح محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی مطالعہ کیا ہے۔

آخر عمر میں بیماری کا بہت زیادہ غلبہ رہا جس سے ممکن تھا کہ حافظہ پر

اثر پڑتا۔ مگر فضل ایزدی سے آپ کو یہ عارضہ لاحق نہیں ہوا۔ حالانکہ بہت سے کامل محدثین کے حافظہ میں آخر عمر میں اختلاط آگیا تھا۔ اس اعتبار سے آپ آیۃ من آیات اللہ تھے۔

جزئیات فقہیہ نہ صرف فقہ حنفی کی بلکہ ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کی بھی اکثر بیشتر آپ کو محفوظ تھیں۔ مگر حضرت باوجود اس کمال فقاہت وحفظ کے اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر فن میں اپنی رائے رکھتا ہوں۔ اور کسی کی تقلید نہیں کرتا۔ لیکن فقہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا اور اس میں امام اعظم کا مقلد ہوں۔

علم حدیث میں جو کچھ آپ کا مرتبہ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس فن مبارک میں اللہ تعالیٰ نے وہ کمال آپ کو عطا فرمایا تھا کہ عرب وعجم میں اس کی نظیر مشکل بلکہ قریباً ناممکن ہے۔ کمال حافظہ کی وجہ سے علاوہ صحاح ستہ کے دیگر کتب مبسوطہ حدیث مطبوعہ وقلمی آپ کو ازبر تھیں۔

مرحوم کا یہ تبحر صرف علوم عقلیہ اور نقلیہ ہی میں نہ تھا بلکہ حضرت کو یہی کمال حاصل تھا کہ کسی فن کی کوئی کتاب ملی اور اس کو شروع سے آخر تک ضرور ایک بار مطالعہ فرمالیا۔ اور جب کبھی سالہا سال کے بعد اس کے متعلق کوئی بات چھڑی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرمادیا کہ سننے والے ششدر وحیران رہ گئے۔

ایک بار پنجاب سے ایک صاحب علم جفر کے متعلق چند مشکل ترین سائل حل کرنے کے لئے حضرت کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوئے آپ نے ان کو تسلی بخش جواب عنایت فرما کر واپس فرمایا۔ فلسفہ جدید (جدید سائنس) اور

جدید ہیئت کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا اور اپنے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ وہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ وہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہیئے۔

حضرت نے علم طب کا بھی بتمام وکمال مطالعہ کیا تھا۔ اور جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب کو علم طب کی کتابیں پڑھائیں جو اس وقت دیوبند میں ایک نہایت کامیاب مطب کر رہے ہیں۔

۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن آرہا تھا تو اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ سیارواس آنجہانی کی روح کو حاضر کرکے اس سے سائمن کمیشن کے نتیجہ کے متعلق دریافت کیا گیا۔ سیارواس کی روح نے جواب دیا کہ سائمن کمیشن کو ہندوستانیوں کے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑے گا۔

احقر (محمد میاں) اس زمانہ میں مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد میں خود حضرت موصوف وحضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ وحضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب کے حکم کے بموجب کام کر رہا تھا۔ اس خبر سے احقر کو خلجان پیدا ہوا۔

اگرچہ مسلمان عامل بھی عملیات سے ارواح کو حاضر کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ خود میں نے اپنے خاندان کے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ ارواح خبیثہ کو حاضر کرکے ان سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ مگر اس کی نوعیت دوسری

ہوتی ہے۔ ایک مدبر اور لیڈر کی حیثیت سے سیار داس کی روح کو حاضر کرنا اور اس سے استفادہ اور وہ بھی ان یورپ زدہ دماغوں کی طرف سے جو خود روح ہی کے منکر تھے ایک تعجب انگیز بات تھی۔

چنانچہ جب دیوبند حاضری کا اتفاق ہوا تو احقر نے حضرت قدس اللہ سرہُ العزیز کی خدمت میں اپنے شبہات پیش کیے۔

حضرت موصوف قدس اللہ سرہُ العزیز نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر فرما کر روح اور اس کے حالات کو شرح و بسط سے سمجھایا۔ یورپ روح کا منکر تھا پھر کس طرح قائل ہوا اس کی تحقیق اس مسئلہ میں کیا ہے۔ اور کس طرح اپنی تحقیق میں اضافہ کر رہا ہے۔ امریکہ والوں کو اس مسئلہ سے کس قدر دلچسپی ہے، حقیقت کیا ہے اور اس مسئلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ غرض روح کے متعلق تمام گوشوں پر محققانہ روشنی ڈالی حضرت کی تقریر جاری تھی، گویا سمندر امنڈ رہا تھا میں محوِ حیرت تھا اور میرا دل اطمینان و انشراح کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سیکڑوں اوراق کے مطالعہ سے وہ بات نہ پیدا ہوئی جو حضرت کی اس تقریر سے پیدا ہوگئی ہے[1]

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ میں علمی تبحر و کمالات ظاہری و باطنی

---

[1] میں نے مکان پہنچکر اس تقریر کو قلمبند کر لیا تھا۔ مگر افسوس اس گرانقدر یادداشت کو دیمک نے ضائع کر دیا۔ وہ تمام تقریر محفوظ نہیں رہی۔ البتہ بطور خلاصہ چند ضروری اشارات درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۰ پر ملاحظہ فرمایئے)

کے ساتھ زہد و تقویٰ کی یہ حالت تھی کہ جس طرح آپ علم و فضل میں تمام معاصرین سے ممتاز تھے اسی طرح آپ زہد و تقویٰ، ورع و پرہیزگاری میں بھی بے مثل تھے۔

آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بار بار طلب کیا گیا بڑی بڑی تنخواہیں پیش کی گئیں۔ لیکن آپ نے کبھی بڑی تنخواہوں کو ترجیح نہیں دی اور ہمیشہ دیوبند و ڈابھیل کے خشک خطوں ہی کو پسند فرمایا۔

بچپن میں آپ کو لہو و لعب اور فضول و بیکار باتوں سے سخت نفرت رہی اور دورِ شباب بھی سراسر عصمت و عفت۔ متانت اور سنجیدگی کا دور تھا۔ منہیاتِ شرعیہ تو کیا مشتبہات سے بھی ہمیشہ اس طرح شدت سے اجتناب

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۵۶) (۱) شیخ سعدیؒ کی روح کو حاضر کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہیں ہوسکی کیونکہ اس کا مقام بلند تھا اور جو روحیں بطور ہو کل مطلوب روح کو لیکر آتی ہیں حضرت سعدیؒ کے مقام بلند تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی تھی۔ (۲) جھوٹ بولنے۔ اپنے خیالات یا اپنے مذہب کا پروپیگنڈا کرنے کی عادتیں روحوں میں باقی رہتی ہیں۔ (۳) احادیث مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں قیامت تک عالم برزخ میں رہیں گی۔ جنت یا دوزخ میں داخلہ قیامت کے روز حساب و کتاب کے بعد ہوگا۔ قیامت تک جنت یا دوزخ کے آرام یا تکلیف کے اثرات ان روحوں پر پہنچتے رہتے ہیں اور وہ ان اثرات کی راحت یا اذیت محسوس کرتی رہتی ہیں۔

(۴) عالم برزخ۔ یہی زمین و آسمان کے درمیان کی فضا ہے۔

واحتراز فرمایا کرتے تھے کہ گویا ایک مجددِ اسلام اپنے طریقہ عمل سے شریعت حقہ پر ثابت وقائم رہنے کی عملی تلقین کر رہا ہے۔

ابتدائے عمر ہی سے تجرد و تفرد اور دنیاوی امور سے یکسوئی کو نہ صرف پسند فرمایا کرتے تھے بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کا پورا پورا ثبوت [۱] دیا۔ اس جہان علم و عمل کی اس مختصر تاریخ حیات کو ہم حکیم الامت حضرت قبلہ مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ارشادات پر ختم کرتے ہیں۔

زعیم احرار حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیان ہے کہ حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے فرمایا کہ میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک۔

دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا امت مسلمہ میں وجود بھی ہے۔ اگر دینِ اسلام میں کسی قسم کی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دینِ اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے"

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے حضرت کی وفات کے بعد ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو جامعہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا کہ

---

[۱] مولانا مشیت اللہ صاحب رئیس بجنور حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے مخلص دوست تھے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی حضرت کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے ہیں آپ کا ارشاد ہے کہ زمانہ طالب علمی میں حضرت شاہ صاحب بستر پر لیٹ کر کبھی بھی نہیں سوتے تھے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جب غنودگی آتی تھی بیٹھے بیٹھے سو لیتے تھے اور جب غنودگی ختم ہو جاتی مطالعہ میں مشغول ہو جاتے تھے۔ آخر شب میں تہجد آپ کا معمول تھا۔

مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عزیز الدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے! کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے ورنہ اگر حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد بھی زورِ ابن تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے۔

حضرت علامہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ العزیز۔ اجلاس ہشتم جمعیۃ علماء ہند منعقدہ ۲، ۳، ۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء مطابق ۶، ۷، ۸ جمادی الاخری ۱۳۴۶ھ بمقام پشاور کے صدر تھے۔ اس زمانہ میں شدھی سنگٹھن اور ہندو مسلم بلووں کے طویل سلسلہ نے ہندوستان کی فضا کو مکدر کر رکھا تھا۔ اور نہرو رپورٹ نے جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے درمیان میں کشیدگی پیدا کر رکھی تھی۔ تفرقہ بندی کے اس پُر آشوب دور میں حضرت محترم کے سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے خطبہ صدارت کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

حب وطن کی شرعی حیثیت ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گذر گئیں۔ انھوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود

ہیں۔ موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب و گل سے ہے۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان مذہبی اور تمدنی یادگاریں ہیں۔ کروڑوں روپیہ کی جائیدادیں ہیں۔ اعلیٰ شان تعمیروں اور وسیع قطعات زمین کے مالک ہیں۔ ان کو ہندوستان سے ایسی محبت ہے۔ جیسے ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہیئے۔ اور کیوں نہ ہو جب ان کے سامنے اپنے سید و مولیٰ۔ اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حب وطن میں اسوۂ حسنہ موجود ہے، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے جور و ستم سے مجبور ہو کر حکم خداوندی کے ماتحت اپنے پیارے وطن مکہ معظمہ سے ہجرت کے وقت وطن عزیز کو خطاب کر کے فرمایا۔

"خدا کی قسم خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے اور اگر میری قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں کبھی تجھے نہ چھوڑتا"۔ اس کے بعد جب حکم الٰہی سے آپ نے مدینہ طیبہ میں سکونت فرمائی اور ہجرت کے بعد دار الہجرت سے منتقل ہونا محبوب و مستحسن نہ تھا اس لئے گویا مدینہ طیبہ آپ کا وطن ہو گیا۔ اور اس میں بحیثیت وطن رہنا تھا تو اس کے لئے دعا فرمائی۔

اللھم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد۔	بار خدایا مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنا دے جیسا ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ محبت دیجیے۔
اللھم بارک لنا فی صاعنا و فی مدنا و فی تمرنا ضعف ما جعلت بمکۃ من البرکۃ	اے اللہ ہمارے صاع[1] ہمارے مد۔ اور ہماری کھجوروں میں مکہ کی برکت سے دو چند برکت عطا فرما۔
اللھم ان ابراھیم عبدک	خداوندا آپ کے بندے آپ کے خلیل حضرت ابراہیم

[1] "صاع" اور "مد" پیمانوں کے نام ہیں۔ صاع میں ۴ سیر چھٹانک گیہوں آتے ہیں اور مد صاع کا چوتھائی ہوتا ہے۔

وخلیلك دعاك لاهل مكة للبركة وانا محمد عبدك ورسولك ادعوك لاهل المدينة ان تبارك لهم فی مدهم وصاعهم مثلی ما بارکت لاهل مكة مع البركة بركتين۔

علیہ السلام نے آپ سے مکہ والوں کیلئے برکت کی دعا کی تھی۔ میں تیرا بندہ تیرا رسول "محمد" ہوں اہل مدینہ کے لیے تیری بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ انکے مد اور صاع میں اس برکت سے جو برکت اہل مکہ کو عطا فرمائی دو چند برکتیں عطا فرما۔ ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں نازل فرما۔

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات حب وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کیا ممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبہ حب وطن سے خالی ہو اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ ان کو بھی طبعی طور پر اپنے وطن سے محبت ہونی چاہیئے۔ اس لیے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے۔

افغانی خطرہ کا حل یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا۔ نہایت پست خیال ہے اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں کی طرف سے کسی معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہوں گے اور ہمسایہ کی تعدی کا شکار نہ ہوں گے تو ان کا رویۂ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ ہونے کی حالت میں ہوتا ہے۔ اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہو۔

اس سے زیادہ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جب مسلمانان ہندوستان اپنے معاہدہ کی وجہ سے پابند ہوں اور غیر مسلم اقوام سے ان کا معاہدانہ برتاؤ واجب ہو تو ایسی حالت میں کسی مسلمان بادشاہ کو مذہبًا اس کی اجازت نہیں کہ مسلمانان ہند کے معاہدہ کو توڑے اور ہندوستان پر حملہ آور ہو بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ مسلمانان ہند کے اس معاہدے کا پورا پورا احترام کرے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

ذِمَّةُ المسلمین واحدة	مسلمانوں کا عہد اور ذمہ داری ایک ہے
یسعیٰ بھا ادناھم	ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرے تو دوسروں پر اس کا احترام لازم ہے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا ارشاد ہے۔

کل صلح جائز الا صلحا احل حراما او حرم حلالا	یعنی سوائے اس صلح کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے۔ ہر قسم کی صلح جائز اور درست ہے۔

میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کریں۔ اور اس معاہدہ کو دیانتداری اور خلوص کے ساتھ پورا کریں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار مخلص ہمسایہ پائیں گے۔ کیونکہ مسلمان حکم قرآنی کے بموجب معاہدہ پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ	جن غیر مسلمانوں سے تم نے معاہدہ کیا اور انھوں نے ایفائے عہد میں تمہارے

شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ

ساتھ کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی تو تم بھی معاہدہ کی مدت تک معاہدہ پورا کرو۔ بیشک اللہ تعالےٰ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔

وقال ایضاً

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔

جب تک غیر مسلم تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی سیدھے رہو۔ بیشک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

(۳) دارالاسلام۔ دارالحرب دارالامان

اس موقع پر ایک اور بات بھی قابل غور ہے جس کے پیش نظر نہ رکھنے سے بسا اوقات شدید غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں اول جو اسلامی حکومت اور اس کی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں دوسرے جو دارالامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو "دارالحرب" میں جاری ہوتے ہیں۔ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ العزیز نے تصریح فرمادی ہے کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب کا فتویٰ اس وقت کا ہے جب موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان میں اسلامیت کا رنگ بہت گہرا تھا۔

ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالامان کے احکام کتب

مذہب میں تلاش کریں اہل علم تفصیل کے لیے در منتقیٰ کے اس باب کو ملاحظہ فرمائیں جس میں اختلاف دار کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔

متحدہ قومیت | اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اگرچہ میں اس مختصر خطبہ میں دار الامان کے تمام احکام پر روشنی نہیں ڈال سکتا تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ اشارات ضرور کردوں۔ اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ میں آپ کو سید الاولین والآخرین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاہدہ کی بعض دفعات کی طرف توجہ دلاؤں۔ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء زمانہ ہجرت میں باہم مسلمانوں اور یہود مدینہ کے ساتھ کیا تھا۔ ان واقعات کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ مسلمان دار الامان یا دار الحرب میں غیر مسلم اقوام کے ساتھ کس قسم کا معاہدہ کرسکتے ہیں چونکہ معاہدہ کی عبارت بہت طویل ہے اور عربی عبارات کے نقل کی چنداں حاجت نہیں ہے اس لیے میں صرف قابل ذکر دفعات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک معاہدہ ہے جو مسلمانان قریش اور مسلمانان مدینہ اور اُن لوگوں کے درمیان نافذ ہوگا جو مذکورہ جماعتوں کے ساتھ متفق و حلیف بن گئے ہیں اور اُن کے ساتھ محاربات میں شریک رہے ہیں۔

(۱) یہ تمام معاہد جماعتیں (قریش، مہاجرین، انصار، یہود مدینہ)

دوسری غیر مسلم غیر معاہد جماعتوں کے مقابلہ میں ایک جماعت[لہ] اور ایک قوم شمار ہونگی۔ (اس کے بعد مسلمانوں کی مختلف جماعتوں قریش۔ انصار اور قبائل انصار کے متعلق چند دفعات نقل کرنے کے بعد مندرجہ ذیل دفعات نقل کی ہیں محمد میاں)

(۱۲) مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو کہ فتنہ وفساد برپا کرتا ہو۔ اور خلق خدا کو ستاتا ہو۔[لہ] تمام مسلمانوں کو متفق ہو کر اسے

لہ اس سے انکار نہیں کہ اس معاہدہ میں باہمی تنازعات کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو آخری فیصلہ تسلیم کیا گیا تھا مگر ظاہر ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کے اشتراک عمل کے لئے اسکو شرط کی حیثیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ اگر کسی موقعہ پر مسلمانوں کی یہ حیثیت نہ ہو اور غیر مسلم قوم سے اشتراک عمل کے بغیر خود مسلم مفاد تباہ و برباد ہو رہا ہو اور ایک تیسری قوم کو تقویت پہنچتی ہو جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کو کچل رہی ہو تو کیا مدبرین اسلام کے لیے جائز ہوگا کہ وہ خاموشی کیساتھ مسلمانوں کے ملی اور اجتماعی مفاد کی بربادی کا تماشہ دیکھتے رہیں۔ اور کیا الحرب خدعۃ کا تقاضا یہ نہ ہوگا کہ وہ غیر مسلم سے اشتراک کر کے اس تیسری جماعت کو ختم کر دیں۔ علاوہ ازیں اس موقعہ پر رئیس المحدثین حضرت شاہ محدث[ؒ] اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی کے پیش نظر یہ ہے کہ قومیت کا مدار مذہب پر نہیں بلکہ حالات اور مقتضیات کے پیش نظر مسلم اور غیر مسلم کو بھی ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (محمد میاں عفی عنہ)

لہ ہندو اور انگریز دونوں کی مثال سامنے رکھو۔ اور پھر غور کرو کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کس نے ختم کی۔ کس کے قوانین نے مسلمانوں کو مفلس اور قلاش بنا دیا اور کس کے کورس و نصاب تعلیم نے مسلم نوجوانوں کو زندقہ اور الحاد کے طوفان کی نذر کر دیا۔ حجاز مقدس، شام، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامیہ کی تباہی اور قحط بنگالہ جیسے جگر شگاف حوادث و سوانح کے شرمناک دھبے کس کے دامن پر ہیں وغیرہ وغیرہ۔

خلاف کام کرنا لازم ہے۔ اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

(۳/۵) مسلمانوں کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ مسلمان کے خلاف غیر مسلم محارب کو مدد دے اور اس کی اعانت کرے۔[۱]

(۴/۶) خدائے تعالیٰ کی پناہ اور ذمہ داری اور عہد ایک ہے۔ یعنی اگر کسی ایماندار بندے نے کسی کو خدا کی پناہ دیدی تو دوسرے مسلمان کو بھی اس کا پورا کرنا لازم ہے خواہ وہ پناہ دینے والا ادنیٰ درجہ کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

(۵/۷) اگر کوئی قوم مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف برسرِ پیکار ہو تو مسلمانوں کو مسلمان کی اعانت واجب ہے۔

(۶/۸) جن یہود نے ہمارے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے، ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مدد اور ان کے ساتھ مواسات (ہمدردی) کا برتاؤ کریں اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔ اور نہ ان کے خلاف کسی ظلم کی مدد کی جائے۔

(۷/۱۱) مسلمانوں کو پابندیٔ عہد میں اعلیٰ مقام پر رہنا اور ارفع ترین مکارم اخلاق کا ثبوت دینا اسلامی فرض ہے۔

(۸/۱۵) یہود بنی عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں۔ یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے۔ مذہب کے سوا باقی امور میں مسلمان اور یہود اور بنی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے۔ ہاں جو ظلم اور عہد شکنی یا کوئی جرم کرے گا وہ اس کی جزا کا مستحق ہوگا۔

---

[۱] انما المومنون اخوۃ (تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں) اس آیت کو ذہن نشین کرو۔ اور پھر فلسطین، حجاز، عراق، وغیرہ جملہ ممالک اسلامیہ پر نظر ڈالو تم خود فیصلہ کرلو گے کہ غیر مسلم محارب کون ہے۔

(۸) اگر مسلمان یا یہود معاہدین کے برخلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہو کر لڑنا ہوگا۔ اور مسلمان لشکر اپنے مصارف اور یہود لشکر اپنے مصارف کا ذمہ دار ہوگا۔

(۹) اپنے پڑوسیوں کو اپنی جان کی برابر سمجھو بشرطیکہ وہ بڑی بھی مضرت رسانی اور جرائم کا ارتکاب نہ کریں۔

اس معاہدے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ایک عالمانہ بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

علماء احناف نے اس معاہدہ کو سامنے رکھ کر دار الحرب و دار الامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کیے ہیں۔

فقہائے احناف نے دار الحرب میں عقود فاسدہ کے جواز کا حکم دیکر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ دار الحرب اور دار الاسلام کے احکام میں بہت فرق ہے مثلاً عصمت (تحفظ) کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) عصمت موثمہ۔ یعنی ایسی عصمت جس کے توڑنے والے کو گناہ ہوتا ہے مگر کوئی بدل واجب نہیں ہوتا۔

(۲) عصمت مقومہ۔ یعنی اس کے توڑنے والے پر اس نفس معصومہ کا بدل بھی واجب ہوتا ہے۔

اب عصمت موثمہ تو صرف اسلام لے آنے سے حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ اگر کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا جائے تو قاتل کے لیے جزائے جہنم کی وعید تو بہر حال لازم ہے خواہ دار الحرب میں قتل ہو یا دار الاسلام میں

البتہ دیت یا قصاص وغیرہ کے احکام اسلامی شریعت کے بموجب جب ہی عائد ہوں گے جبکہ دار الاسلام میں ہو۔

مختصر یہ کہ عصمت مؤثمہ تو صرف اسلام لے آنے سے حاصل ہو جاتی ہے مگر عصمت مقومہ کے لیے دار الاسلام اور حکومت و شوکت اسلامیہ کا ہونا شرط ہے۔

اس بحث کے خاتمہ پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دار الاسلام اور دار الحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی شرائط پر صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں۔ (صفحہ ۲۰ خطبہ صدارت)

یہ علمی بیش بہا خطبہ صدارت ۸۲ صفحات پر ہے جس میں اس زمانہ کے سیاسیات پر بصیرت افروز مباحث کے بعد صوبہ سرحد کے مراسم قبیحہ کی اصلاح کے متعلق بھی مفید مباحث ہیں۔ آخر میں عربی قصیدہ ہے جس کے آخری دو شعروں پر ہم حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کی سیرت کو ختم کرتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للذی	هدانا لهذا ومتلا ای مرشد
صلوٰۃ وتسلیم علی خیر خلقہ	ختام جمیع الانبیاء محمد

حضرت علامہ استاد مولانا عزیز الرحمن صاحب مفتی اعظم دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے برادر بزرگ تھے۔ تقدس، طہارت، زہد و عبادت۔ سادگی مزاج تبحر علمی میں مخصوص۔ جلالت و عظمت اور مخصوص سیرت کے مالک تھے۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کے خلیفہ اعظم تھے۔ طریقت اور سلوک کے ماہر تھے۔ سیکڑوں مشتاقان طریقت نے آپ سے فیض حاصل کیا۔

مدرسہ میں تدریس کے ساتھ افتاء کی جلیل الشان خدمت انجام دیتے تھے۔ سفر اور حضر میں فتاویٰ کا گڈا آپ کے پاس رہتا۔ جب بھی موقع ملتا تحریر فرمانا شروع کر دیتے۔

تقریباً اٹھارہ ہزار فتاوے آپ نے اپنے زمانہ میں تحریر فرمائے۔

آپ کے بعد دار العلوم دیوبند کو آپ جیسا مفتی اب تک میسر نہیں آیا۔ اور مستقبل قریب میں کوئی توقع بھی نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جناب مولانا عتیق الرحمن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین دہلی۔ آپ کے خلف اکبر ہیں۔ دوسرے صاحبزادے حافظ حاجی جلیل الرحمن صاحب ہیں۔ خداوند عالم دونوں کو دارین کی سعادت اور عظمت عنایت فرمائے۔ آمین۔

سیدنا شیخ الہند ثانی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

لا زالت شموس برکاتہ بازغۃ

سیاسیات ہندی کا نشاں ہے ذات سے تیری — یہ کشتی امن بحیرہ میں رواں ہے ذات سے تیری

اسیر مالٹا کی جانشینی تجھکو حاصل ہے — سحاب حریت گوہر فشاں ہے ذات سے تیری

غلاموں کو سکھایا تونے آئینِ جہاں بانی

کیا ہے فخرالدین رازی کی سنجی - بو علی سینا اور فارابی کی منطق - ابن حزم اور ابن رشد کی حکمت - صرف ایک نتیجہ ہے ذکی الطبع افراد کی پُر عافیت کتب بینی کا -

کیا ہے ترک دنیا اور مستغرقانہ تصوف - ایک خوشگوار جذبہ ہے - دنیاوی جھگڑوں سے فارغ البالی کا بہت آسان ہے - سالہا سال اعتکاف کے مکاشفات اور مراقبات کی لُطف اندوزی، بہت سہل ہے - برسہا برس مطالعہ کتب کر کے تبحر علمی کے ملکات کی فراہمی، بہت سہل ہے - کسی خانقاہ کی کنج عزلت - بہت سہل ہے کسی دار العلوم کی مسند تدریس -

تم پوچھو ـــــــ مشکل کیا ہے ؟

میں بتاؤں گا بہت مشکل ہے - رجوع الی اللہ زہد اور تقوے کے ساتھ خدمتِ خلق اور نوعِ انسانی کی ہمدردی - یعنی وہ سوز و گداز، وہ تڑپ

وہ بے چینی، جو کبھی مسجد میں لے جائے۔ کبھی حلقۂ درس میں کبھی ممبر پر وعظ و تلقین کے لئے کھڑا کرے۔ کبھی سیاسی پلیٹ فارم پر ترقی ملت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے۔

پھر کبھی اپنوں کی گالیاں سنوائے اور کبھی پابزنجیر جیل خانوں کی سلاخوں میں بند کرائے۔ دن کے وقت خدمت خلق مصروف اور پریشان رکھے تو رات کی تاریکی میں محبوب حقیقی کے سامنے راہب شب بیدار بنا کر کھڑا کردے۔

بلاشبہ بہت مشکل ہے۔ ہمدردیٔ خلق۔ اور غمخواری مسلم کی وہ خلش۔ جو رات کی میٹھی نیند حرام کردے۔ مجلس احباب کو مجلس سوز و گداز بنادے۔

افق پر صبح صادق کی کرن چمکے تو وہ توبہ و استغفار میں مشغول ہو۔ آفتاب کی پہلی کرنیں اس کو تسبیح و تہلیل میں مشغول دیکھیں۔ پھر اس کے تبلیغی، تعلیمی۔ مذہبی اور سیاسی مشاغل کو دیکھتے دیکھتے حیرت و استعجاب کی مغرب میں روپوش ہوجائیں۔ عالم پر تاریکی کی سیاہ چادر تانی جائے تھکے ماندے انسان اپنی آرام گاہوں کی طرف دوڑیں۔ اہل و عیال کی پرلطف چہل پہل سے دن بھر کی کوفت دور کریں۔ لیکن یہ بتلائے سوز خلق اب بھی یا دور دراز سفر طے کررہا ہو۔ یا عالی اور عمیق مضامین کے حل کرنے میں دماغ سوزی کررہا ہو۔ یا مخلوق خدا کی تلقین میں مشغول ہو۔ یا اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود۔ گریہ و بکا۔ عجز و نیاز۔ مناجات و تلاوت طویل قیام، طویل رکوع و سجود سے زاہدان خشک کے خلوت خانوں کو شرما رہا ہو۔

بیشک یہی ہے مشکل ترین سنت ۔ یہی ہے انبیاء علیہم السلام کی سچی وراثت یہی ہے مضمون حدیث کے بموجب انبیاء سابقین علیہم السلام سے مشابہت یہی شخص ہے رحمۃ اللعالمین[1] صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ۔ اسوہ صحابہ کا سچا پیرو۔ یہی ہے مصلح وقت ۔ یہی ہے شیخ وقت ۔ یہی ہے مرشد صادق ۔ یہی ہے قطب عالم اسی کی زندگی درس عبرت ہے ۔ قابل اتباع بلکہ واجب الاتباع ہے ۔

اچھا بتاؤ دور حاضر میں کون ہے اس مقدس زندگی کا مالک اور اس مبارک سنت کا حامل و ماہر، وہی شیخ وقت قطب عالم ۔ مرشد خلائق جس کا نام نامی اس تمہید کا مبارک عنوان ہے ۔ یعنی

سیدنا و مرشدنا شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام

حضرت علامہ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند مدظلہ العالی دامت برکاتہ

دار العلوم دیوبند اپنی قسمت پر جس قدر ناز کرے کم ہے کہ ہر زمانہ میں اس کی صدارت کے لئے قدرت کے ہاتھوں نے مخلوق کا بہترین فرد منتخب فرمایا

---

[1] شمائل ترمذی میں ارشاد ہے ۔ افضلھم عندہ اعمھم نصیحۃ و اعظمھم عندہ منزلۃ احسنھم مواساۃ و موازرۃ ۔ یعنی صحابہ کرام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں وہ سب سے افضل ہوتے تھے جن کی خیر خواہی مخلوق کے لیے زیادہ عام ہو اور بارگاہ رسالت میں ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہوتا تھا ۔ جو غم خواری اور خدمت خلق کے سلسلہ میں جفا کشی اور تحمل و برداشت میں سب سے بہتر ہوں (ملاحظہ ہو حدیث حسن بن علی رضی اللہ عنہما ص۲۴ شمائل ترمذی شریف) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے (بقیہ صفحہ آیندہ پر)

آج بھی مجدد وقت دار العلوم دیوبند کا شیخ الحدیث ہے۔

گرمیٔ ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے
جس سے ہے پرچم روایات سلف کا سربلند (ظفر علیخاں)

شیخ الاسلام کی زندگیٔ مبارک کے مختصر حالات

میں اس وقت اس گستاخی کو پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو میں نے مذکورہ بالا مضامین کے سلسلہ میں اکابر ملت کی شان میں کی۔ میں نے اپنی ناقص فہم ناقص استعداد۔ اور ناقص واقفیت کے ساتھ ایک مختصر فرصت میں ان حضرات کے حالات قلم بند کیئے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہا اور ان حضرات کے شایان شان سیرت نہ لکھ سکا۔ مگر میں اب اس گستاخی اور قصور کا عادی ہو گیا۔ لہٰذا اگر اپنی تمام کوتاہی ناواقفیت اور نادانی کے ساتھ اس شیخ وقت کی مختصر سوانح حیات قلمبند کروں تو اگرچہ گستاخی و کوتاہی ہوگی مگر نئی نہ ہوگی۔

ولادت باسعادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ ۱۱ بجے شب سہ شنبہ برج قمر بمقام قصبہ بانگر مؤ ضلع اناؤ۔ تاریخی نام چراغ محمد۔ آبائی وطن موضع الہ داد پور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان المسلم اذا کان یخالط الناس ویصبر علی اذاھم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم ترمذی شریف ج ۲

یعنی وہ مسلمان جو لوگوں سے ملتا رہتا ہے اور ان کی اذیت پر صبر کرتا ہے اس مسلمان سے بہتر ہے جو نہ کسی سے ملتا ہے نہ کسی کی اذیت برداشت کرتا ہے۔

تحصیل ٹانڈہ۔ ضلع فیض آباد۔

سلسلۂ نسب | آپ حسینی سید ہیں۔ آپ کا خاندان تقریباً انیس پشت بیشتر ہندوستان میں آیا۔ والد ماجد حضرت سید حبیب اللہ صاحب حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ راشد تھے

۱۳۰۹ھ میں جب کہ عمر مبارک ۱۲ سال تھی۔ آپ کو دیوبند۔ سیدنا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں بھیجدیا گیا۔ یعنی ایک شفاف آئینہ کو آفتاب جہاں تاب کے سپرد کیا گیا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کی فراستِ کاملہ نے اس سعادتِ عظمیٰ کو پہچان لیا جس کے آثار بشرۂ مبارک سے نمایاں تھے۔

مخصوص شفقت کے ساتھ اپنی اولاد کی طرح تربیت شروع فرمائی۔ اپنی نگرانی میں رکھا۔ اور باوجودیکہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مشاغل بڑی جماعتوں کو بھی خارجی اوقات میں کسی کتاب کے درس کا موقع نہ دیتے تھے۔ مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو ابتدائی کتابیں بھی خود ہی پڑھائیں۔

نیازمندی سعادت اور ایثار کی بھی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند کے یہاں سے کسی نے فرمائش کی کہ بھنگی سے نالی صاف کرادو بھنگی نہیں ملا۔ مگر نالی صاف ہوکر دھل بھی گئی۔ معلوم ہوا کہ حسین احمد نے اپنے ہاتھ سے کیچڑ کو صاف کیا تھا (بروایت مولانا جلیل احمد صاحب کیرانوی خادم حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ واستاذ دارالعلوم دیوبند)

صرف سات سال کے عرصہ میں جملہ علوم متداولہ سے فارغ ہو کر قطب العالم امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت بھی ہو گئے۔ ۱۳۱۶ھ میں والد ماجد قدس اللہ سرہٗ العزیز نے جملہ اہل و عیال سمیت بغرض ہجرت۔ بیت اللہ شریف کا قصد فرمایا تو آپ بھی ان کی رفاقت میں حجاز مقدس تشریف لے گئے۔

امام ربانی مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مراحل سلوک طے کرنے کے لیے اپنے شیخ مرشد یعنی سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز مہاجر مکی کی خدمت میں حاضری کا ایما فرمایا۔ چنانچہ مکہ معظمہ پہنچکر مراحل سلوک حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی زیر تربیت طے کیے۔

حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں چند ماہ حاضر رہ کر دار ہجرت یعنی مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ جس سے چند ماہ بعد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے رحلت فرمائی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے جوار رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم میں رہ کر وہ تمام فیوض حاصل کیے جو ایک باخدا انسان اس جمع الجود والکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار مبارک سے حاصل کر سکتا ہے۔

دورِ ابتلا یہ پورا گھرانا مدینہ طیبہ پہنچا تو رہائش کے لیے ایک مدنی صاحب نے مکان دیدیا۔ اور انھیں صاحب کے مدرسہ میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے بصورت ملازمت تدریس شروع کردی۔

لیکن پھر کچھ ناگواریوں کی بنا پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو یہ

تعلق منقطع کرنا پڑا۔ اور مدنی صاحب موصوف نے مکان بھی خالی کرا لیا۔

اس عرصہ میں جو کچھ اثاثہ والد صاحب کے پاس تھا وہ بھی ختم ہونے لگا اور فاقہ کی نوبت آنے لگی۔ تب حضرت والد صاحب نے اپنی تمام اولاد کو مخاطب کرکے فرمایا

میں مدینہ طیبہ میں ہجرت کرکے حاضر ہوا ہوں۔ آپ محض زیارت بیت اللہ کیلئے آئے تھے۔ جس سے فارغ ہو چکے۔ اب یہاں بسر اوقات کی بظاہر کوئی شکل نہیں اس وقت کچھ تھوڑی بہت رقم اتنی ہے کہ آپ کسی صورت سے ہندوستان پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے یہی ہے کہ آپ سب اپنے وطن چلے جائیں۔ میں یہاں مقیم رہونگا

حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور جملہ متعلقین نے جواب دیا۔

خداوند عالم رزاق ہے۔ ہم فقر و فاقہ سے نہیں گھبراتے۔ شکم پری کی اگر کوئی صورت نہ ہو تو درختوں کی پتیاں کھا کر بھی اس سرزمین پاک میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مگر ظل ہمایوں سے مفارقت گوارا نہیں[1]

---

[1] حضرت مولانا نے سوانح خود نوشت میں تحریر فرمایا ہے۔ والد صاحب مرحوم نے مدینہ طیبہ پہنچکر مصارف سفر میں سے جو سرمایہ بچا تھا۔ حسب حصص شرعی تقسیم کر دیا۔ اور فرمایا میں نے ہجرت کی نیت کی ہے۔ میں یہاں ہی مرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں تو یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ تم سبھوں کو میری طرف سے اجازت ہے۔ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ۔ چونکہ ایسے شفیق مربی۔ ضعیف العمر کا تنہا چھوڑنا انتہائی بے مروتی تھا اس لئے نہ کوئی اولاد میں سے اور نہ والدہ ماجدہ اُن کی جدائی پر راضی ہوئیں۔ اگرچہ سوائے والد ماجد مرحوم کے کسی نے بھی ہجرت کی نیت نہیں کی تھی۔ اور سب نے قصد کیا تھا کہ جب تک والد صاحب زندہ ہیں یہاں رہیں گے۔ ۱۲

لیکن جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے جنھوں نے حب رسول اللہ کا اظہار کیا تھا۔ فرمایا تھا۔ اگر تمہیں میرے سے محبت ہے تو فاقہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جو جھول کی طرح تمہیں گھیرے گا۔"

اس خاندان پر بھی فاقہ جھول بن کر آیا۔ چنانچہ متواتر چند ماہ اس حالت میں گذرے کہ ایک وقت میں تھوڑی سی مونگ کی دال میسر آتی تھی جس کو پکا کر گھر کے سب آدمی تھوڑی تھوڑی پی لیتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔

اس وقت اس گھرانے کے افراد کی تعداد ۱۳ تھی اور سب اس دور ابتلا میں اس قدر صابر و شاکر تھے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے حرم اطہر میں درس دینا شروع کر دیا تھا۔ اسی فاقہ میں صبح سے شام تک درس کا مشغلہ جاری رہتا۔

پابندیٔ اصول | حضرت[1] مولانا عبدالحق صاحب مدنی جو آجکل جامعہ قاسمیہ

---

[1] آپ کا آبائی وطن دیوبند ہے۔ آپ عثمانی شیخ ہیں۔ آپ کے والد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب برطانوی فوج میں ڈاکٹر ہو کر افریقہ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے بمقتضائے غیرت اسلام و شوق زیارت دربار حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) فوج کی ملازمت چھوڑ کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ترکی فوج میں ڈاکٹر ہو گئے اور ساری زندگی رفاہیت اور خوشحالی سے بسر کی۔ مولانا عبدالحق صاحب مدنی کی ولادت مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ وہیں آپ نے تعلیم پائی اور تعلیمی خدمات میں مصروف رہے۔ شعر و سخن کا خاص ذوق ہے۔ حجاز مقدس کے بلند پایہ شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ جرمنی کے زمانہ میں جب عربوں نے ترکوں سے بغاوت کی تو آپ ترکوں کی پناہ میں رہے۔ ترکی حکومت کے (باقی آئندہ صفحہ پر)

مدرسہ شاہی مراد آباد کے مدیر ہیں۔ اس دورِ ابتلا کے راوی ہیں۔[1]

مدنی صاحب کے والد ماجد ترکی فوج میں ڈاکٹر تھے۔ اور اس کے علاوہ مدینہ طیبہ میں بھی آپ کا مطب بہت کامیاب تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے چاہا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مولانا عبدالحق صاحب مدنی کو بطور ٹیوشن تعلیم دیتے رہیں۔ لیکن عین اسی زمانہ میں جب کہ فاقہ کی یہ حالت تھی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے ٹیوشن گوارا نہ فرمایا۔ البتہ اس کے لئے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) خاتمہ پر بے پناہ مصائب برداشت کئے جن کے تذکرہ سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں آپ ہندوستان تشریف لے آئے۔ ابتداء میں چند سال کراچی میں قیام فرمایا۔

مدرسہ عربیہ واقع محلہ کھڈا میں درس حدیث و تفسیر کی خدمت انجام دیتے رہے اس کے بعد آپ کو مسلمانان مراد آباد نے مراد آباد طلب کر لیا۔ تقریباً ۲۶ء سے آپ مراد آباد میں تعلیم فرما ہیں۔ ۳۳ء سے آپ کو جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کا اعزازی صدر مہتمم بنا دیا گیا آپ کی توجہات سے مدرسہ نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی آپ روزانہ صبح کے بعد قرآن پاک کا ترجمہ بیان فرماتے ہیں جس میں شہر مراد آباد کے تقریباً تمام محلوں کے مسلمان سینکڑوں کی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ رمضان شریف میں سینکڑوں مسلمان اپنے اپنے محلوں سے آکر آپ کے پیچھے تراویح پڑھتے ہیں۔ زہد۔ تقویٰ اور شب بیداری میں نمایاں شان کے مالک ہیں۔ رسوم قبیحہ کے سخت مخالف ہیں۔ صاف گوئی آپ کا مخصوص شیوہ ہے۔ بارک اللہ فی علمہ و عملہ۔

---

[1] ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔ رحمہ اللہ

آمادہ تھے کہ بلا کسی معاوضہ حسبۃً للہ جیسا کہ حرم اطہر میں اور طلبہ کو درس دیتے ہیں مولانا عبدالحق صاحب مدنی کو بھی درس دیتے رہیں۔ طرفین سے یہ اصرار عجیب تھا اور اسی میں تقریباً ۶ ماہ گزر گئے۔

آخرکار ڈاکٹر صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے اصرار پر راضی ہو گئے اور مولانا عبدالحق نے مولانا حسین احمد صاحب سے ابتدائی کتابیں شروع کر دیں۔

لطف یہ ہے کہ باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور آپ کے والد ماجد کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ مگر اندرونی فاقہ کی خبر ڈاکٹر صاحب کو بھی اس وقت ہوئی جب کہ وہ دور ابتلا فراخی اور خوشحالی سے بدل چکا تھا۔

عجیب حقیقت یہ کہ عمر مبارک ہنوز تقریباً اکیس سال ہے یعنی خاص دور شباب و نشاط ہے۔ جس میں یہ اصول کی پابندی ہے۔ یہ صبر و شکر ہے یہ زہد و تقویٰ و مجاہدات و ریاضت کی نرالی شان ہے

تعمیر مکان میں سنت نبوی کی اتباع جب کہ مکان خالی کرا لیا گیا اور مدینہ طیبہ میں سب حضرات کے قیام کا ارادہ ہوا تو شہر سے باہر ایک قطعہ زمین لے لیا گیا۔ عورتوں بچوں اور مردوں نے مل کر اپنے ہاتھ سے اینٹیں پا تھیں اور چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تعمیر کیں۔ جن کی چھت بقول مولانا عبدالحق صاحب مدنی اتنی نیچی تھی کہ چارپائی پر کھڑے ہونے سے سر میں لگتی۔ اور اس طرح رہائش کے سلسلہ میں بھی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوہ صحابہ رضوان اللہ

تعالیٰ علیہم اجمعین پر عمل ہوا۔ زہے قسمت۔

ایں سعادت بزور بازو نیست ؎ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا عبدالحق صاحب مدنی کا بیان ہے کہ اس ابتلا کے بعد ہم نے یہ بھی دیکھا کہ حضرت شیخ اور آپ کے بھائیوں نے ایک عالی شان مکان مدینہ طیبہ میں حرمِ اقدس کے قریب تعمیر کرایا۔

اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کے کچھ حالات تذکرۃ الرشید جلد دوم مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی ؒ (جمعیۃ العلماء کے شدید مخالف تھے) کے الفاظ میں پیش کیے جائیں۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب سیاسی مسلک میں حضرت مدنی مدظلہ العالی سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ حضرت مدنی صاحب کے حق میں آپ کی تحریر بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

۱۳۱۶ھ میں حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب سے بیعت ہو کر والد اور برادران[1] کے ہمراہ جد امجد کے

---

[1] بڑے بھائی کا نام مولانا محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھا آپ نے بھی دیوبند میں دینیات کی تعلیم حاصل کی پھر اوائل ۱۳۱۳ھ میں امام ربانی سے بیعت ہو کر کئی سال مجاہدات و ریاضات نفس میں مصروف رہے ۱۳۱۶ھ میں دوبارہ ہندوستان تشریف لا کر گنگوہ حاضر ہوئے عرصہ ہوا آپ کی وفات ہو چکی ہے۔ آپ کے صاحبزادہ مولانا وحید احمد صاحب مدنی تھے۔ جو حضرت شیخ الہند کی رفاقت میں مالٹا میں اسیر رہے مگر افسوس ۱۳۴۵ھ میں آپ کی بھی وفات ہو چکی۔ مولانا وحید احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے عزیز محترم مولوی فرید احمد صاحب د

(بقیہ صفحہ آئندہ)

بلدہ طیبہ (مدینہ منورہ) میں اقامت اختیار کی مکہ معظمہ پہنچکر حسب اجازت امام ربانی قدس سرہٗ۔ اعلیحضرت حاجی صاحب سے رجوع کیا اور اذکار تعلیم فرمودہ قطب العالم پر بھی بہت تمام کاربند رہے۔ اس زمانہ میں جو کچھ واردات عجیبہ وکیفیات غریبہ ظاہر ہوئیں ان کی اطلاع گنگوہ میں آستانہ علیہ پر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۱۵ھ میں حضرت کا والانامہ پہنچا کہ چند روز

(بقیہ صفحہ گذشتہ) سعید احمد صاحب وغیرہ آج کل تعلیم پا رہے ہیں۔ خداوند عالم ان کی سعادت اور آبائے کرام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے آمین۔ مولانا سید احمد صاحب مولانا صدیق احمد صاحب سے چھوٹے اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے بڑے تھے آپ نے مدینہ طیبہ کے حرم اطہر میں "مدرسۃ الایتام" قائم کیا۔ جس میں دینیات کی تعلیم کے ساتھ صنعت وحرفت کی تعلیم بھی دیجاتی ہے۔ حجاز مقدس میں آپ کی ذات بہت غنیمت تھی۔ اہل حجاز آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی اہل حجاز کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ افسوس ۱۳۶۰ھ میں آپ کی بھی وفات ہوگئی۔ خود حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ آپ پانچ بھائی تھے (۱) مولانا محمد صدیق صاحب آپ کا سنہ ولادت ۱۲۹۲ھ تھا (۲) مولانا سید احمد صاحب ۱۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے (۳) حضرت مولانا حسین احمد صاحب سنہ ولادت ۱۲۹۶ھ (۴) مولانا سید محمود احمد صاحب حضرت سے چھوٹے ہیں جو کچھ عرصہ بیشتر جدہ میں قاضی وزیج تھے۔ پانچویں بھائی مولانا سید جمیل احمد صاحب تھے جو حضرت سے چھوٹے تھے عرصہ ہوا وفات پاگئے۔

کے واسطے گنگوہ آکر مجھ سے مل جاتے تو بہتر ہوتا اس فرمان
والاشان پر مطلوب بن کر باوجود تنگدستی و بے سروسامانی
کے مراجعت ہندوستان کا تہیہ کر لیا۔ باپ کا باقتضائے
محبت جی چاہا کہ بھائیوں میں سے کوئی ایک رفیق سفر ہوتا تو
اچھا تھا۔ چھوٹے بھائی مولوی سید احمد صاحب جو ان کے دو
چار مہینے آگے پیچھے سلسلہ خدام میں داخل ہوئے تھے۔ غلبہ شوق
کے سبب فرضی ضروریات ذاتی و خانگی قائم کر کے باپ سے ہمراہی
برادر کی اجازت بھی لے چکے تھے۔ مگر قدرت کو منظور ہی کچھ اور
تھا۔ بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب در پردہ خفیہ انتظام
کے چھپ کر چند روز پہلے روانہ بھی ہو لیے۔ جس کی اطلاع
بارہ گھنٹے بعد قریب مغرب ہوئی۔ مجبوراً مولانا سید احمد صاحب
کو ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ اور مولانا حسین احمد صاحب تنہا روانہ ہوئے
جدہ میں دونوں بھائی مل گئے۔ اور حج بیت اللہ سے فارغ
ہو کر گنگوہ پہنچے۔ چند روز گذرے تھے کہ امام ربانی نے ایک
ایک جوڑا یعنی ملبوس کرتہ اور پائجامہ دونوں بھائیوں کو عطا
فرمایا۔ چونکہ اس میں ٹوپی یا عمامہ نہ تھا۔ اس لیے دونوں میں
سے کسی صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ ارشاد ہو تو ہم
خدام اپنا اپنا عمامہ حاضر کریں۔ اپنے دست مبارک سے عطا
فرما دیا جائے۔ یہ سنکر حضرت نے سکوت فرمایا اور بمقتضائے ادب

دونوں بھائی عطیہ قطب العالم کو سر آنکھوں پر رکھ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں صاحب بلائے گئے اور حکم ہوا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ۔ اور جب دونوں صاحبوں نے اپنے عمامے حاضر کئے تو حضرت امام ربانی نے اپنے دست مبارک سے دونوں کے سروں پر باندھ کر ارشاد فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے۔

مولانا محمد صدیق صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ "دستار فضیلت" ارشاد ہوا "دستار خلافت" امام ربانی قدس سرہٗ کی قولی و فعلی خلافت کے مجموعہ کے مثال میں آپ کے خلفا کے اندر صرف یہی دو حضرات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن کے کمالات علمیہ و عملیہ اسی سے ظاہر ہیں کہ مدنی مہاجر اور بطحائی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پڑوسی ہیں۔

مولانا حسین احمد صاحب کا درس بحمد اللہ حرم نبوی میں بہت عروج پر ہے اور عزت و جاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علماء کو کیا معنی یمنی اور شامی بلکہ مدنی علماء کو بھی وہ بات حاصل نہیں ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آپ سر تا پا خلق۔ مہمان نواز۔ غیور۔ باحیا۔ اور بعض ان صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔

(صفحہ ۱۵۸ و صفحہ ۱۵۹ تذکرۃ الرشید)

مختصر یہ کہ زائد سے زائد ۲۲ سال کی عمر ہے کہ چشمہ رشد و ہدایت خود سے ساقی کو بلا کر خلافت صادقہ کا خلعت عنایت فرما دیتا ہے۔ زہے قسمت۔

۱۳۱۶ھ کے مذکورہ بالا سفر کے بعد ۱۳۲۶ھ تک مسلسل جوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام رہا۔ حرم پاک میں حلقہ درس روز افزوں ترقی کر رہا تھا اور آپ صحاح ستہ اور تفسیر و فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کے تقریباً ۱۵ سبق روزانہ پڑھاتے تھے۔ نماز صبح کے بعد سے سلسلہ درس شروع ہو کر عشاء بعد تک رہتا۔

آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی اور شیخ الحرم کے خطاب سے آپ معروف ہو گئے تھے۔

۸ سال بعد ۱۳۲۶ھ میں آپ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ جمعیۃ الانصار، موتمر الانصار اور دار العلوم کا جلسہ دستار بندی (جس کا ذکر پہلے گذرا) آپ کی جد و جہد کے رہین منت تھے۔

تین سال بعد آپ دوبارہ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ اگلے سال یعنی ۱۳۳۰ھ میں آپ دوبارہ ہندوستان تشریف لائے اور چند ماہ قیام فرما کر واپس مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ اس موقع پر یہ تنبیہ کر دینی مناسب ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ انقلاب کی تجاویز ہندوستان میں شد و مد سے جاری تھیں اور جنگ یورپ کا آغاز ہو رہا تھا۔

۱۳۳۳ھ میں سیدنا شیخ الہند (مولانا محمود الحسن صاحب) بھی ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے۔ فراغت حج کے بعد ۱۳۳۴ھ ۔۔۔۔۔۔

میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں مشاغل درس برابر جاری رہے مگر اسی سال جمال[1] پاشا انور پاشا مرحوم مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور پھر کچھ عرصہ بعد عربی حکومت کا انقلاب ہوگیا۔ شریف نے ترکوں سے بغاوت کی اور ۲۳ صفر شب یکشنبہ ۱۳۳۵ھ کو شریف حسین نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا عزیر گل۔ مولانا حکیم نصرت حسین مرحوم اور مولانا وحید احمد صاحب مدنی مرحوم کو گرفتار کر کے انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب اس وقت شریف کی رعایا تھے۔ بہت ممکن تھا آپ کو چھوڑ دیا جاتا۔ یا کسی اور طرح سزا دیجاتی لیکن آپ نے حضرت شیخ الہند کی رفاقت کی از خود خواہش کی بالآخر آپ کو بھی جبراً پہنچا دیا گیا۔

---

[1] حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی نے علماء بنگال کانفرنس منعقدہ ۹، ۱۰ ار فروری ۱۹۴۶ء بمقام کملا سوا گنج میں ارشاد فرمایا۔ ۱۹۰۹ء میں جنگ طرابلس بلقان شروع ہوئی تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس دار العلوم دیوبند نے مختلف جماعتوں کو آزاد قبائل سرحد میں متعلق کیا حضرت حاجی ترنگ زئی مرحوم مولانا لطف الرحمن صاحب مولانا فضل ربی مولانا فضل محمود مولانا محمد میاں مرحوم عرف مولوی محمد منصور انصاری مولانا عبید اللہ صاحب سندھی اور دیگر حضرات سے اس میں بہت کچھ کام لیا اور اسی بنا پر خود ترکی کے سپہ سالار و وزیر اعظم "انور پاشا" مرحوم اور جمال پاشا مرحوم وغیرہ سے ملے اور بہت کچھ کام انجام دیے مگر شریف حسین کی بغاوت اور اس کی نالائقی سے اسیر ہوگئے اور مالٹا میں ساڑھے چار برس مقید رہے (صـ۳۴ و صـ۳۵)

جملہ اقارب، اعزہ۔ مکان۔ اور سامان کو بنام خدا مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ میں چھوڑا۔ اور تسلیم و رضا کی راہ میں خود کو امتحانات کے لئے پیش کر دیا۔ (اسارت مالٹا وغیرہ کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔)

والد ماجد اور بھائی جان کو ترکی گورنمنٹ نے اپنی حراست میں ایڈریانوپل پہنچادیا۔ جہاں ان حضرات کو اعزاز کے ساتھ رکھا گیا۔ حضرت والد ماجد اور مولانا محمد صدیق صاحب کی وفات وہیں ہوئی۔ بالآخر ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ موصوف جملہ رفقاء اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہندؒ کے ساتھ مالٹا سے رہا کئے گئے۔ اس اثناء میں آپ کے والد ماجد۔ بڑے بھائی۔ اہلیہ محترمہ اور برخوردار لخت جگر سب کے سب کچھ انقلابی مصائب اور کچھ امراض وغیرہ میں مبتلا ہوکر واصل بحق ہوچکے تھے۔ لیکن حضرت موصوف کے جوش حریت اور جذبات اعلاء کلمۃ اللہ نے اب بھی اجازت نہ دی کہ براہ راست مدینہ طیبہ جائیں بلکہ خلافت اسلامیہ کے بقا اور تحفظ کے لیے ہندوستان میں جدوجہد کو مفید سمجھ کر ہندوستان تشریف لائے اور تحریک استخلاص وطن و تحریک خلافت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے لیکن اہل ہند کی بدقسمتی سے صرف پانچ ماہ بعد حضرت شیخ الہند کی وفات ہوگئی اور ایک مسلم لیڈر کی وفات سے شیرازۂ ملت منتشر ہونے لگا

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد دنیا نے آپ کو حضرت شیخ الہندؒ کا سچا جانشین سمجھا اور حضرت موصوف نے (باوجودیکہ آپ کو اس لفظ سے بطور کسر نفس تکلیف ہوتی تھی) مذہبی اور ملکی خدمات کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد فوجی بھرتی پولیس اور فوج کی ملازمت کی حرمت کے فتوے کے سلسلے

میں جو کراچی میں حضرت موصوف کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔ اور مولانا نثار احمد صاحب۔ مولانا محمد علی صاحب، مولانا شوکت علی صاحب نے اس کی تائید فرمائی تھی گرفتار ہو کر دو سال قید بامشقت کی مصیبت برداشت کی (مقدمہ کراچی ایک مشہور مقدمہ ہے جس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔)

کراچی سے رہائی کے بعد دنیا نے رہا ہونے والوں کے بڑے بڑے جلوس نکالے۔ مگر حضرت موصوف کا مخصوص طرز عجیب وغریب تھا۔ آپ جہاں تشریف لےگئے اچانک پہنچ گئے کسی کو اطلاع بھی نہ ہو سکی کہ کب تشریف لائے۔

دیوبند میں شدید انتظار تھا۔ استقبال کے انتظامات بھی ہوئے تھے۔ لیکن آپ شب کو ۲ بجے بالکل خاموشی کے ساتھ دیوبند وارد فرما ہو کر حضرت شیخ الہند کے مکان پر پہنچ گئے۔ صبح کو سنا گیا کہ رات حضرت جانشین شیخ الہند تشریف لے آئے۔ مرادآباد والوں نے شاندار جلوس کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر ان کو یکایک معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مدرسہ شاہی میں تشریف فرما ہیں۔

مالٹا اور کراچی کے زمانہ اسارت میں آپ کے اہم ترین مشاغل دو تھے۔ (۱) قرآن پاک کا حفظ (۲) سلوک وطریقت کے مراحل طے کرنا۔

اسارت کراچی کے زمانہ میں مولانا محمد علی مرحوم نے آپ سے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھا۔ مولانا محمد علی مرحوم آپ کو چھیّا بھائی کہا کرتے تھے اور استاذانہ تکریمات سے پیش آیا کرتے تھے۔

اس کے بعد آپ تقریباً چھ سال سلہٹ "بنگال" میں ایک

جامعہ اسلامیہ کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔ بلامبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ خداوند بالا و برتر نے صوبہ آسام کی اصلاح کے لئے یہ غیبی تائید فرمائی تھی۔ اس تمام عرصہ میں تدریس کے علاوہ آپ کا بڑا شغلہ اشاعت و تبلیغ تھا۔

حقیقت میں ان مجاہدات کا تصور بھی انسان کو ہیبت زدہ کر دیتا ہے جو حضرت موصوف کو وعظ و تبلیغ کے سلسلے میں برداشت کرنے پڑے۔ بنگال اور آسام کے دیہات جن کے ہر طرف ندیاں اور نالے ہیں آپ انھیں ندیوں اور نالوں کی سرزمین میں رات کے وقت وعظ و تبلیغ کے سلسلے میں پاپیادہ خطرناک جنگلوں، نالوں اور ندیوں کو طے کرتے ہوئے دیہات میں پہنچتے اور جتنے آدمی بھی جمع ہو سکتے اُن کو خداوندی احکام سُناتے۔ ایسا بھی ہوا کہ سفر کی تمام دشواریوں اور پریشانیوں کو طے کر کے جس جگہ پہنچے وہاں وعظ سننے والے صرف سات آٹھ آدمی ہی تھے۔ مگر آپ مجمع کی قلت سے کبھی بھی کبیدہ خاطر نہ ہوئے اور اس ہی بشاشت کے ساتھ ان کو اللہ کے احکام سُنائے جس بشاشت سے ہزارہا کے مجمع کو سناتے۔

بہرحال اس مجاہدہ کا اثر بحمد اللہ بہت خوشگوار ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد سارا ضلع سلہٹ آپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ آپ کے اخلاص و ایثار پر دارفتہ اور شیدائی ہو کر حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگا۔

سلہٹ اور اطراف سلہٹ کے رہنے والوں نے ہزاروں کی تعداد میں آپ سے شرف بیعت حاصل کیا۔

۱۳۴۶ھ میں آپ کے سامنے دارالعلوم دیوبند کی صدارت پیش کی گئی جس کو آپ نے دارالعلوم کے مصالح کے بموجب پسند فرمالیا۔ لیکن ہندوستان کی سیاسی حالت اور سیاسی خدمات کا جذبہ جو آپ کے رگ وپے میں نفوذ کرگیا تھا اس نے اجازت نہ دی کہ عام مدرسین کی طرح آپ ملازمت اختیار کرلیں۔ بلکہ اہتمام کے سامنے اپنے سیاسی مذاق اور سیاسیات ہند کی اہمیت کو صفائی سے پیش کرتے ہوئے کچھ شرطیں لگالیں جن کا مفاد یہ ہے کہ

(۱) سیاسی خدمات کے لیے آپ آزاد ہوں گے۔

(۲) سیاسی امور میں مدرسہ کی جانب سے کوئی رکاوٹ عائد کی جائیگی

(۳) ہر مہینہ میں ایک ہفتہ آپ کو اختیار ہوگا کہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے دیوبند سے باہر دوسرے مقامات پر سفر کرسکیں۔ جس کے لئے کسی رخصت یا اطلاع کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اس سے زائد پر تنخواہ وضع کی جائے گی۔

اور پھر آپ کا کمال تقویٰ ہے کہ جب حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کی وفات ہوئی اور فریضہ اہتمام مولانا محمد طیب صاحب (موجودہ مہتمم) کے سپرد ہوا تو آپ نے ارکان شوریٰ سے اُن شرائط کی دوبارہ تجدید کرائی۔

اس وقت حضرت شیخ کی خدمات ملیہ اہل ہند سے پوشیدہ نہیں۔ جو انجمن جمعیۃ یا کانفرنس بھی مسلم مفاد کی خاطر ہندوستان میں بنائی جاتی ہے محض اس اضطراب اور جذبہ کی بنا پر کہ مسلمانوں کو کسی طرح فائدہ پہنچے۔ ان کی حالت کسی طرح روبہ اصلاح ہو آپ اس میں شرکت فرماتے ہیں۔ اور درحقیقت ترقی پذیر سیاسیات ہند کی آپ روح رواں ہیں۔ چند

سال ہوئے ایک ہفتہ بلا وضع تنخواہ کی شرط ارکان مجلس شوریٰ کے کرم سے حذف کر دی گئی۔ اور اب تمام مدرسین مدرسہ کی طرح آپ کی تنخواہ بھی وضع ہوتی ہے۔ پورے سال میں صرف پندرہ یوم کی رخصت اتفاقیہ بلا وضع تنخواہ مل سکتی ہے۔

لیکن سیاسی تبلیغی، تدریسی۔ تینوں قسم کی خدمات اور مزید براں دارالعلوم دیوبند کی صدارت کے (منصبی) فرائض۔ یعنی خصوصی مشورے۔ نگرانی، چندہ کی مساعی، مالیات کی اصلاح وغیرہ وغیرہ بیک وقت ادا کرنا در حقیقت حضرت محترم ہی کا ظرف اور آپ ہی کی ہمت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ راحت و آرام۔ بیفکری اور سکون سب کچھ قربان ہو گیا۔ شب و روز کی ایک مسلسل جدوجہد ہے جس کو وہ انسان انجام دے رہا ہے جس کو خدا نے فوق العادت روحانی قوت عطا فرمائی ہے۔

شب کو کئی گھنٹہ مسلسل تقریر۔ اس کے بعد سفر اور صبح مدرسہ میں پہنچ کر مسلسل کئی گھنٹہ تک ڈھائی سو طلبہ کی جماعت کو درس دینا جس میں ہر قابلیت اور ہر مذاق کے طلبہ موجود ہوں جن میں بعض وہ بھی ہوں جو کئی سال مدرسی کرکے محض سماعت حدیث کے لئے حاضر ہوئے ہوں پھر وہ دماغ سوز شفقت جو ڈھائی سو تین سو طلبہ کے وسیع حلقہ میں تقریر کرتے ہوئے پیدا ہو۔ پھر اسی طرح ظہر بعد۔ عصر بعد۔ بسا اوقات عشا بعد۔ برابر درس۔

اور پھر ایک دو دن نہیں۔ ہمیشہ مسلسل۔ اور نہ صرف دن کو بلکہ شب کو بھی اسی طرح مشاغل کا تسلسل۔ مثلاً قیام دیوبند کے زمانہ میں مغرب بعد

صلوٰۃ اوابین جن میں کم از کم سوا پارہ یومیہ کی تلاوت۔ پھر مسترشدین کو تلقین یا بیعت پھر عشا بعد کم از کم دو گھنٹہ درس حدیث۔ کتب عینی۔ اخبارات دیکھنا۔ ان سے یادداشتیں مرتب کرنا۔ جن کا بیش بہا ذخیرہ ہزارہا صفحات کا اس وقت حضرت موصوف کے پاس موجود ہے۔ پھر آخر شب میں تہجد اس کے بعد ذکر و مراقبہ وغیرہ وغیرہ۔

غور فرمایئے کہ کیا کوئی ہے جو اس طرح مسلسل اپنے آپ کو قربان کرتا رہے۔ تحسین و آفرین۔ انسان کی ہمت کو بلند کر دیا کرتی ہے مگر یہاں تحسین و آفرین کے بجائے افترا و بہتان ہے۔ دشنام طرازیاں ہیں۔ توہین و تذلیل کے منصوبے ہیں۔ (نصیب اعدار) قتل کی سازشیں اور قاتلانہ حملے ہیں۔ غیروں کی طرف سے نہیں بلکہ خود اپنوں کی طرف سے اس جگر فگار اور دلخراش طرز عمل کے باوجود متواتر جد و جہد اور رات دن سعی پیہم کا سلسلہ وہی باقی رکھ سکتا ہے جس کو خداوند عالم نے غیر معمولی خلوص اور للہیت کی دولت عطا فرمائی ہو اور لایخافون لومۃ لائم[1]۔ اور لا نرید منکم جزاءً ولا شکورا[2]۔ کا ملکہ اس کا رگ و پے میں راسخ ہو چکا ہو ہم جیسے آرام طلب مولوی اپنی تن آسانی کو چھپانے کے لئے حضرت شیخ پر اعتراضات کیا کرتے ہیں کہ اس غیر معمولی مشغولیت اور لامحدود سلسلہ سفر کے ساتھ طلبہ کی خدمت ناممکن ہے۔

---

[1] کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

[2] یعنی ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ صرف حضرت حق جل مجدہٗ کی رضاجوئی کے لئے۔ تم لوگوں سے نہ ہم کوئی معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے خواستگار ہیں۔

لیکن جبکہ حضرت شیخ کے آغاز درس یعنی ۱۳۴۶ھ سے دورۂ حدیث کے داخلہ کی تعداد روز افزوں ہو گئی ہے اور نہ صرف دورہ حدیث کے طلبہ بلکہ دارالعلوم دیوبند کے کل طلبہ ۹۹ فیصدی حضرت شیخ کے گرویدہ اور جاں نثار ہو کر واپس ہوتے ہیں۔

تو کیا کوئی انصاف پسند جو رشک وحسد کے بدترین مرض سے محفوظ ہو۔ اس قسم کے اعتراضات کی طرف التفات کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اختتام سال پر کتاب کے ختم ہونے میں دشواریاں ہوتی ہیں۔ زمانہ امتحان میں بھی بخاری شریف ہوتی رہتی ہے۔ مگر کیا حضرت شاہ صاحب[1] قدس اللہ سرہ العزیز کے زمانہ میں ایسا نہ ہوتا تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ دورۂ حدیث میں بہت سے وہ حضرات شرکت کرتے ہیں جو بار بار کتب حدیث پڑھ چکے ہوتے ہیں اور اب ان کا مقصد تشفی اور اطمینان حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایسے طلبہ کے سوالات بسا اوقات اسباق میں تاخیر پیدا کر دیتے ہیں اور بالخصوص حضرت شیخ مدظلہٗ العالی کے اخلاق اس درجہ وسیع ہیں کہ کسی طالب علم کے کسی سوال پر کسی وقت بھی آپ بچیں بجبیں ـــــ نہیں ہوتے۔

---

[1] حضرت العلامہ استاذ مولانا انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے آخری دور میں زیادہ سے زیادہ شرکاء دورہ حدیث کی تعداد (۹۰) ہے اور حضرت شیخ مدظلہ العالی کے زمانہ میں اسی جماعت کے طلبہ کی تعداد ڈھائی سو کے قریب پہنچ چکی ہے اور کل طلبہ کی تعداد تقریباً سولہ سو رہتی ہے۔ اللّٰھم زد وبارک۔

اس طرح ایک ایک مسئلہ میں پوری جماعت کی طرف سے بسا اوقات دسیوں سوالات ہوتے ہیں۔

سالانہ جشنِ عبادت | تقریباً دس ماہ تدریسی اور تبلیغی مشاغل میں اس پروگرام کے ساتھ گذرتے ہیں جو اوپر بیان ہوا لیکن رمضانِ مبارک کا مبارک مہینہ عجیب شان سے گذرتا ہے۔

ہم نے شان دار ماضی میں تفصیل سے لکھا ہے کہ حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہٗ العزیز اور آپ کے خلفاء صوبہ بنگال کی اصلاح کی طرف خاص طور سے متوجہ رہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب جو اپنے اکابر کے صحیح جانشین ہیں وہ بنگال کو اپنی توجہات کا مرکز کیسے نہ بناتے۔

قیام سلہٹ نے قدرتی طور پر مسلمانان بنگال بالخصوص مسلمانانِ آسام کا تعلق حضرت شیخ سے وابستہ کر دیا۔ اب اہل سلہٹ کچھ ایسے عاشق ہو گئے ہیں کہ رمضان المبارک کا مبارک مہینہ انھوں نے اپنے لیے مخصوص کرالیا ہے۔

تمام سال وہ تمناؤں اور مرادوں میں گذاتے ہیں اور جیسے ہی شعبان المعظم شروع ہوتا ہے دعوتی خطوط اور تار پہنچنے لگتے ہیں۔ اگر کچھ شبہ ہو جاتا ہے تو سلہٹ سے وفود حاضر ہونے لگتے ہیں۔

بہر حال ۲۷، ۲۸ر شعبان تک حضرت شیخ دیوبند سے روانہ ہو کر سلہٹ پہنچتے ہیں۔ وہاں پہنچکر آپ کے مشاغل حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

پورے بنگال سے خاص خاص متوسلین سلہٹ پہنچنے لگتے ہیں۔ کچھ قیام کرتے ہیں اور کچھ زیارت کر کے اور دو چار روز حاضر خدمت رہ کر واپس

ہوجاتے ہیں۔ اوسطاً پانسو حضرات کا مجمع ہر روز رہتا ہے۔

حضرت موصوف مختصر سے افطار کے بعد نماز مغرب سے فارغ ہوکر صلوٰۃ الاوابین میں شغول ہوتے ہیں۔ اس وقت ایک ڈیڑھ پارہ کی تلاوت ہوتی ہے۔ پھر تراویح میں پانسو چھ سو آدمی شریک ہوتے ہیں۔ قرآن شریف حضرت شیخ خود سناتے ہیں۔ مسجد میں تراویح سے فراغت کے بعد ایک اور قرآن نوافل میں ہوتا ہے پھر تھوڑی دیر آرام فرماکر تہجد شروع کرتے ہیں جس میں سلسلہ وار قرآن شریف ختم کرتے ہیں یہ مبارک سلسلہ صبح صادق سے تقریباً نصف گھنٹہ بیشتر تک جاری رہتا ہے۔ آخری وقت میں سحری تناول فرماتے ہیں پھر نماز صبح سے فراغت پاکر کچھ آرام فرماتے ہیں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے آرام کے بعد زائرین سے ملاقات اور مجمع زائرین میں وعظ و پند کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ باشندگان سلہٹ و مضافات سلہٹ اپنے مکانات پر بھی مجالس وعظ منعقد کرتے ہیں۔ قیام گاہ کی مجلس وعظ کے بعد ان مجالس میں شرکت فرماتے ہیں۔ پھر دوپہر کو قلیل سا قیلولہ فرماتے ہیں۔ نماز ظہر کے بعد قرآن شریف سننے اور سنانے کا سلسلہ عصر تک جاری رہتا ہے۔ بعد عصر مغرب تک تذکیر و تلقین میں صرف ہوتا ہے۔

اسی طرح دن اور رات میں نو نو اور دس دس قرآن شریف کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ مجالس وعظ وغیرہ اس کے علاوہ

نماز عید سے فراغت پاکر واپسی ہوتی ہے۔ بنگال سے دیو بند تک متوسلین اور مشتاقوں کے تقاضوں کے بموجب موقع بموقع قیام فرماتے ہوئے آخر شوال تک دیو بند پہنچتے ہیں۔ پھر اگر حج بیت اللہ شریف کا عزم بھی ہو تو یہ مسلسل سفر متواتر چھ ماہ باقی رہتا ہے۔ جس میں آرام اور راحت کا نام نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا ہے کہ حجاز پہنچکر بھی زائرین کی کثرت آرام کا موقع نہیں دے تی
سنہ ۱۹۲۳ء میں جب آپ حجاز مقدس تشریف لے گئے تو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب
ایم ایل - اے مدرس مدرسہ شاہی مرادآباد بھی ہمراہ تھے۔ حضرت مولانا
عبیداللہ صاحب سندھی اس زمانے میں مکہ معظمہ میں قیام فرما تھے۔ مولانا
محمد اسمٰعیل صاحب کا بیان ہے کہ مولانا سندھی کی خواہش رہی کہ حضرت شیخ سے
ایک گھنٹہ تخلیہ کا موقع مل جائے مگر ممکن نہ ہو سکا۔

جود و سخا استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ
حضرت شیخ کی طبیعت شاہانہ واقع ہوئی ہے۔ یعنی پیسہ کی کبھی پرواہ نہیں ہوتی
دسترخوان اتنا وسیع ہے کہ عموماً پندرہ سولہ مہمان ہمیشہ رہتے ہیں اور بسا اوقات
انکی تعداد اس سے زائد ہوتی ہے۔ مہمان نوازی اور خاطر مدارات کی یہ شان کہ
گیارہ بارہ بجے شب کو بھی کوئی مہمان پہنچتا ہے تو کوشش یہ کی جاتی ہے کہ گرم
روٹی دسترخوان پر پہنچے گھر کی عورتیں بھی اس محنت کشی کی عادی ہو گئی ہیں۔

سیاسی ماحول اور خدمات

حضرت محترم کا ابتدائی زمانہ حضرت شیخ الہند اوّل مولانا محمود الحسن صاحب
قدس سرہ العزیز کی رفاقت میں گذرا۔ لہٰذا اس زمانے کا سیاسی ماحول بھی وہی
تھا جو پہلے گذر چکا۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ چونکہ مولانا حسین احمد صاحب اسارت مالٹا
سے بیشتر تقریباً ۱۲ سال خاص مدینہ طیبہ میں اقامت گزیں رہے تو آپ بینڈنا
حضرت شیخ الہند کی تحریک کے وہ مخصوص اور اہم رکن تھے جو مدینہ طیبہ میں رہ کر خدمات

انجام دے رہے تھے۔ ممالک اسلامیہ سے ربط پیدا کرنا اور خود حجاز کو اغیار کے اثرات سے محفوظ رکھنا آپکا سیاسی فریضہ تھا۔ آپ کے قیام مدینہ کا نتیجہ تھا کہ کرنل لارنس کی زہر آلود تحریک سے مدینہ طیبہ پاک رہا۔ باشندگان طیبہ آخر تک ترکوں کے وفادار رہے اور انہوں نے کرنل لارنس یا میکوہن کی دلفریب تحریک کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔

اسی بنا پر اہل مدینہ پر غلہ بند کر دیا گیا۔ ترکی فوج اور افسروں نے انتہائی جد و جہد کی کہ ان کے لئے رزق کے دروازے کھل جائیں مگر یورپ کے سفید فام درندے رحم کے نام سے نا آشنا تھے۔ حتیٰ کہ بقول حضرت مولانا حسین احمد صاحب حرم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں مجاور بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے بہت سے وہ بھی تھے جو شدت گرسنگی میں مردوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہوئے۔ اور طرح طرح کی لرزہ خیز مصیبتیں برداشت کیں۔

بہرحال حضرت شیخ مدظلہ العالی انقلاب حجاز کے بعد گرفتار کئے گئے بالٹا بھیجے گئے۔ وہاں سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچے یہ تمام تفصیل حضرت شیخ الہند کے حالات کے سلسلہ میں گذر چکی۔ تشریف آوری ہندوستان کے زمانے میں جو سیاسی ماحول تھا وہ بھی گذر چکا۔

اس کے بعد حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے کوئی نیا پروگرام قوم کے سامنے پیش نہیں فرمایا بلکہ اسی پروگرام پر عمل پیرا ہیں جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ترتیب دیگئے تھے

البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے زمانہ میں چونکہ اس پر عمل زیادہ عرصہ تک نہیں ہو سکا۔ لہٰذا اس کی تفصیلات بھی حضرت موصوف کے سامنے نہیں آئیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ کو (جانشین شیخ الہند اور مسلم حلقہ میں تحریک کا قائدِ اعظم ہونے کی حیثیت سے) اسکی تفصیلات پیش کرنی پڑیں اور پیش فرمارہے ہیں اور اس تفصیل کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ اس ماحول کو کسی قدر زیادہ تفصیل سے پیش کریں۔

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ جنگ جرمنی کے بعد جب برطانیہ اور اس کے حلیفوں کو فتح نصیب ہوئی تو دنیا کی سیاست کا نقشہ بالکل بدل گیا۔

اہل سیاست پوری طرح واقف ہیں کہ ذرائع آمد و رفت کی وسعت اور سہولت نے اب تمام دنیا کو ایک ملک کی حیثیت دیدی ہے۔ مشرق اور مغرب کے بعید ملکوں کے ڈانڈے ایک دوسرے سے اس طرح ملا دیے ہیں کہ دنیا کی کسی ایک حکومت کا انقلاب، تمام دنیا کی سیاست کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔

مصارف جنگ کی بے پناہ زیادتی نے حکومتوں کا مالک انھیں جماعتوں کو بنا دیا ہے جو ملوں اور مشینوں کی مالک ہیں اور لاتعداد دولتوں کے خزانے ان کے پیروں کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان جیسے براعظم میں کسی دوسری حکومت کے ذریعہ سے انقلاب پیدا کیا جائے تو ہندوستان کو کیا فائدہ ہوگا ہم آزادی کے دلدادہ ہیں۔ آقا کی تبدیلی ہم نہیں چاہتے اور اگر اسلامی اخوت

کے نقطہ نظر سے ہم انقلاب بپا کرنا چاہیں یعنی افغانستان اور ایران یا دور حاضر کے تمام اسلامی ممالک کو ملا کر ہندوستان پر حملہ کریں تو کیا برطانیہ اور اس کے حلفا کے مقابلہ میں یہ جنگ کامیاب ہو سکتی ہے۔

ہٹلر کی فوجیں طوفان بنکر اٹھیں۔ مگر اقتصادی مشکلات کے بھنور میں پھنسکر تباہ ہو گئیں۔ جاپان کے برقِ خرمن سوز کو امریکہ کے ایٹم بم نے آبگینہ بنا دیا۔ جو ایک ہی گولہ سے چور چور ہو گیا۔

اخبارات کے کالم شاہد ہیں کہ اس جنگ کے زمانہ میں صرف برطانیہ کا خرچہ جنگ ۲۳ کروڑ روپیہ یومیہ تک ہوتا رہا۔ اور امریکہ نے تقریباً ۴ کھرب سالانہ تک خرچ کر ڈالا۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ مذہب کے نام پر جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہے تم ہی بتاؤ کیا پہلی اور دوسری عظیم کا محرک مذہب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب نہ کبھی قتل و خون کا سبب بنا نہ اب سبب ہے۔ اغراض پرستوں کی خود غرضی نے ہمیشہ انسانی خون کے ساتھ ہولی کھیلی۔ اور وہی اب بھی پشت زمین کو ظلم و ستم کا لالہ زار بنائے ہوئے ہے ہمیشہ یہی ہوا کہ ظلم و ستم کی فراوانی نے مظلوموں کو موت پر آمادہ کیا۔ وہ قتل کیے گئے۔ آخر کار ظالم کا ظلم خود اُس کے گلے پڑا۔ چنانچہ کبھی اس کو دریائے نیل میں غرق کر دیا گیا اور کبھی غزوۂ بدر میں شکست دیکر مظلوموں کو فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی گئی۔ اور پھر ان کو ہدایت کی گئی کہ ملک ابوجہل اور ابولہب یا قیصر و کسریٰ کا نہیں۔ ملک خدا کا ہے تم آگے بڑھو اور خدا کے ملک کو ظلم سے پاک کرو۔ خدا کی مخلوق کو مظلومیت سے نجات دلاؤ۔

تم ہی بتاؤ۔ جنگجو رحمۃ للعالمین تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ابوجہل اور ابولہب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو غرقابی کے لیئے دعوت دی تھی۔ یا وہ خود بنی اسرائیل کے تعاقب کے لیے نکلا تھا؟

بہرحال آج بھی دنیا کے سامنے یہی نقشہ ہے۔ برقی اور اسٹیم نے دنیا کے غریبوں کو بے روزگار بنا دیا ہے۔ اور ساری دولت سرمایہ داروں اور مل کے خزانوں میں بھر دی ہے۔ اب اصل سوال بھوک اور فاقہ کشی کا ہے یہاں مذہب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ سرمایہ دار مذہب کی آڑ لیکر بھوکوں کی ٹکر سے بچا جاتا ہے۔ مگر اس سے سرمایہ داروں کو نجات تو کیا ملتی، ہاں یہ نقصان ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ بھوکے جب مصنوعی مذہب کو ظالم کے ساتھ دیکھتے ہیں تو وہ مذہب سے متنفر ہو جاتے ہیں۔

زار روس کا آخری کارنامہ یہی ہے کہ اس نے مذہب کے نادان اور لالچی پیشواؤں کا ایمان خریدا۔ ان کو غریبوں اور مزدوروں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بے دینی اور لامذہبی بالشوزم کا جزو اعظم بن گئی۔

لہذا آج ہر ایک مدبر اور ہوشمند کا انسانی اور اسلامی فرض ہے کہ وہ غلط اور خام خیالات کے ذریعہ سے انقلاب کے پریشان خواب دیکھنے کے بجائے خود کو اور اپنی مذہبی حمیت و غیرت کو مدبرانہ تحریک کا جزو بنا دے۔

لیکن اس کے لیئے سب سے اہم کام یہ تھا کہ مسلمانوں میں اپنی غربت، افلاس اور اپنی فاقہ مستی کا احساس پیدا ہو۔ ان کی اقتصادی حالت کیا تھی۔ پھر ان کو کس طرح کنگال کر دیا گیا، ان کی صنعت و حرفت کو کس طرح تباہ کیا، ان

تمام چیزوں کا شعور پیدا ہو اور پھر جس طرح اقتصادیات کے متعلق احساس و شعور کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ ہندوستانی ہونیکا احساس اور حب وطن کا جذبہ بھی ان میں پیدا ہو۔ تاکہ وہ غیر ملکی مفاد کی خاطر اپنے ملک اور خود اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو تباہ و برباد کرنے کے پرانے مرض سے نجات پائیں۔

کاش ہمارے سامنے گذشتہ دو سو برس کی تاریخ ہو۔ تو ہم سمجھ سکیں کہ ہم نے احساس کے نہ ہونے کے باعث کس طرح خود کو تباہ کیا۔ کس طرح اپنی سلطنت برباد کی۔ اور پھر کس طرح دنیا کی دوسری آزاد قوموں کو۔ اور آہ مسلم اقوام کو۔ اور آہ ثم آہ خاص حجاز مقدس اور حرم اقدس کے رہنے والوں کو برباد کیا۔ غلام بنایا اور تباہ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ علماء مذہب کا کام تبلیغ ہے، درس و تبلیغ ان کا مشورہ ہونا چاہئے۔ آٹا۔ اناج۔ سوت کپاس کے نرخ سے ان کو کیا واسطہ؟

مگر خدارا بتاؤ کہ ہندوستان کے یہی غیور مسلمان جو علماء ملت پر ہندو پرستی کا الزام لگاتے ہیں گذشتہ جنگ جرمنی کے زمانہ میں انھوں نے عراق، شام، ایران وغیرہ وغیرہ اسلامی ممالک کو انگریز کے لیئے کیوں تباہ کیا خاص قبلہ ایمان اور کعبہ اسلام پر کیوں گولیاں برسائیں۔

اس کا سبب بھوک اور فاقہ بے روزگاری اور تہیدستی تھی؟ یا ان کے دلوں میں اسلام اور ایمان سے نفرت تھی۔ مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ سے عداوت تھی، عربوں اور ترکوں سے کوئی بغض بھرا ہوا تھا۔

انگریز نے عربوں کو ترکوں سے باغی بنایا۔ ان کا سبق یہ تھا کہ آج قومیں مذہب

سے نہیں بنتیں۔ آج قومیں سیاسی اور اقتصادی مصالح کے پیش نظر تربیت دیجاتی ہیں۔ لہذا ترک جدا قوم ہے اور عرب علیحدہ قوم۔ عربوں کے لئے ترکوں کی غلامی عار ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سبق تھا جس کے ذریعہ سے عربوں کو باغی بنا کر نہ صرف ترکوں بلکہ تمام اسلامی ممالک کو برباد کیا گیا۔

ہم اس کے قائل نہیں کہ قومیت صرف سیاسی اور اقتصادی اصول پر تربیت دیجاتی ہے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی اگر عربوں کو ترکوں سے جدا ایک دوسری قوم قرار دیتی ہے تو کیا ہندوستانیوں کو یہ حق نہیں کہ اقتصادی اور سیاسی اصول پر ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلہ میں ایک مستقل قوم قرار دیدیں۔

یہی وہ متحدہ قومیت ہے جو انگریز کی نظر میں سب سے زیادہ مہلک مرض ہے۔

۱۹۳۸ء میں سیدنا شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے دہلی کے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے یہی حقیقت واضح کر دی تھی۔ اب کیا تھا۔ انگریز کو اختلاج ہو گیا۔ انگریز پرست شعراء کی زبانیں دراز ہونے لگیں اور قومیت متحدہ کے خلاف نہ صرف یہ کہ ایک دو تقریریں کی گئیں۔ یا کوئی مضمون نکالا گیا۔ مستقل ادارے قائم کر دیئے گئے جو ہندوستانیوں کے دماغوں سے قومیت متحدہ[1] کے تخیل کو دور رکھیں۔

---

[1] قومیت متحدہ کے متعلق مفصل بحث حضرت شیخ مدظلہ العالی کے رسالہ "قومیت متحدہ اور اسلام" میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں نظریہ کی توضیح کے لئے چند سطور درج کی جاتی ہیں "ہماری مراد متحدہ قومیت سے اس جگہ وہی قومیت متحدہ ہے جس کی بنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی۔ یعنی ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں اور اس پردیسی قوم سے جو کہ وطنی اور مشترک مفاد سے محروم کرتی ہوئی سب کو فنا کر رہی ہے جنگ کر کے اپنے حقوق کو حاصل کریں اور اس ظالم اور بے رحم

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

یہ ہے ظالموں کی وہ چیرہ دستی جس کے مقابلہ پر خدا کے برگزیدہ رسول گڑگڑا کر کہتے رہے انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔

ایک طویل تحریر کے بعد ہم پھر اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے پروگرام کے لئے جزو اعظم دو چیزیں تھیں۔ اقتصادی تباہ حالی کا احساس قومیت مشترکہ کا احساس، کیونکہ تشدد کے بدون آئینی جنگ صرف اسی صورت میں متصور ہے کہ اقوام ہند کی اکثریت ایک نقطہ نظر پر متفق ہو کر اقتصادی اصول پر جد وجہد کرتے ہوئے اور اقتصادی سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہندی قومیت کو نہ صرف ہندوستان تک محدود رکھے۔ بلکہ بیرونی اقوام کی مداخلت اور مقابلہ کے لئے اس کو آلہ کار بنائے۔

سیدنا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ العالی اس پروگرام کو آج سے نہیں بلکہ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے اور ابھی حضرت موصوف

(بقیہ صو گذشتہ) قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعرض نہ کرے بلکہ تمام ہندوستان کی بسنے والی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات اور مذہبی اعمال میں آزاد رہیں سا اپنے مذہبی رسم ورواج مذہبی اعمال واخلاق آزادی کے ساتھ عمل میں لائیں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دیتا ہو امن وامان قائم رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشر واشاعت بھی کرتے رہیں سا اپنے پرسنل لا۔ کلچر۔ تہذیب کو محفوظ رکھیں۔ نہ کوئی اقلیت دوسری اقلیتوں اور اکثریت سے ان امور میں دست وگریباں ہو اور نہ اکثریت اس کی جد وجہد کرے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اندر ہضم کرلے یہی وہ چیز ہے جس کا اعلان کانگریس ہمیشہ سے کر رہی ہے۔ (صہ ۹۱ قومیت متحدہ اور اسلام)

کی وہ تقریریں فراموش نہیں ہوئی ہوں گی۔ جن میں اول سے آخر تک غلّوں کے نرخ اور ہندستانی صنعت پر انگریزوں کے اقوال اور تاریخی حوالجات ہوتے تھے۔

عام مسلمان اس سے دلچسپی نہ لیتے تھے بلکہ ابتدا میں تو یہ صورت تھی کہ دس ہزار کے مجمع میں اگر تقریر شروع کی تو آخر تک مشکل سے پانسو آدمی جلسہ میں باقی رہ جاتے تھے مگر حضرت شیخ مدظلہٗ کا یہ استقلال تھا کہ اول سے آخر تک آپ کی تقریر میں کوئی فرق نہ آتا تھا اور گویا

سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم کے اصول پر کاربند ہوتے ہوئے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اقتصادی امور کو ان کے کانوں میں ڈالیں خواہ وہ دس ہزار ہوں یا پانسو۔

لیکن بیس سال کا عرصہ نہیں ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ مسلمانوں کے مذاق میں اس قدر تبدیلی ہو گئی کہ آج مسلمانوں کے سیاسی اجتماعات میں کوئی تقریر پسند نہیں کی جاتی جب تک اقتصادی مباحث اس میں نہ ہوں اور غلّوں اور کپڑوں کا نرخ ان میں بیان نہ کیا جائے حتیٰ کہ آج مسلم لیگ بھی مجبور ہے کہ وہ اقتصادی پروگرام کا جھنجھنا مسلمانوں کے سامنے رکھے۔

اگرچہ ظاہر ہے کہ اگر لیگ کا مقصد واقعی صنعت و حرفت کی ترقی اور مسلمانوں کا فاقہ و افلاس دور کرنا ہوتا تو عرصہ پیشتر سے لیگ کانگریس کا بازو بن چکی ہوتی۔ کیونکہ اس مقصد میں اتفاق کے بعد ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ دار مزدور۔ زمیندار اور کاشتکار ہندستانی اور غیر ہندوستانی کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

بہر حال اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کی سعادت حضرت شیخ مدظلہ العالی کے لئے مخصوص ہے اور یہ وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کا احساس اب نہیں چند سال بعد مسلمانوں کو ہوگا۔ بشرطیکہ کوئی ترقی قدرت نے ان کے لئے طے کر رکھی ہے۔

مراد ما نصیحت بود کردیم ⁂ حوالت با خدا کردیم ورفتیم

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ وافضل رسلہ وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

خادم خلق اللہ خاکپائے ورثۂ انبیاء **محمد میاں عفی عنہ**

۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء عیسوی

تمام شد حصہ اول

حصہ دوم یہ حصہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں یورپ کی دوسری جنگ عظیم سے پیشتر لکھا گیا تھا۔ جنگ عظیم کے آغاز سے اگست ۱۹۴۶ء تک جو حالات رونما ہوئے۔ ہندوستان کی سیاست میں جو تبدیلیاں پیش آتی رہیں اور اس پُر آشوب انقلابی دور میں حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی اور آپ کی جماعت (جمعیۃ علماء ہند) نے جو خدمات انجام دیں اُنکو علماء حق حصہ دوم میں جمع کیا گیا ہے۔ معلومات کو مکمل کرنے اور موجودہ سیاسیات سے متعلق پوری واقفیت حاصل کرنے کے لئے حصہ دوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ... روپے